راہنمایانِ اسلام

حضرت علامہ سید علی نقی نقوی اعلی اللہ مقامہ

مصباح الہدیٰ پبلیکیشنز

مرکز احیاء آثار
MAAB 1431
maablib.org

MAAB 1431
maablib.org

رہنمایانِ اسلام

رہنمایانِ اسلام

ازافادات

حضرت علامہ الحاج سید علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہٗ

ناشر

مصباح الہدیٰ پبلیکیشنز

ا- گنگارام بلڈنگ - شاہراہِ قائدِ اعظم - لاہور

۵
۷
۱۵
۳۱
۴۳
۵۷
۶۹
۸۱
۹۳
۱۰۳
۱۱۵
۱۲۷
۱۴۱
۱۵۳
۱۶۵
۱۷۵

maablib.org

نام کتاب : رہنمایانِ اسلام

مؤلف : علامہ سید علی نقی نقویؒ

ناشر : مصباح الہدیٰ پبلیکیشنز۔ لاہور

زیر اہتمام : مصباح القرآن ٹرسٹ۔ گنگا رام بلڈنگ لاہور

مطبع : معراج دین پرنٹرز۔ لاہور

اشاعت : شوال المکرم ۱۴۱۷ھ

ہدیہ : روپے

ملنے کا پتہ

قرآن سنٹر

۲۴۔ الفضل مارکیٹ، اُردو بازار۔ لاہور

MAAB 1431

maablib.org

ترتیب

عرض ناشر	۵
تمہید	۷
حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	۱۵
حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام	۳۱
حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا	۴۳
حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام	۵۷
حضرت امام حسین علیہ السلام	۶۹
حضرت امام زین العابدین علیہ السلام	۸۱
حضرت امام محمد باقر علیہ السلام	۹۳
حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام	۱۰۳
حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام	۱۱۵
حضرت امام علی رضا علیہ السلام	۱۲۷
حضرت امام محمد تقی علیہ السلام	۱۴۱
حضرت امام علی نقی علیہ السلام	۱۵۳
حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام	۱۶۵
حضرت امام حجت منتظر عجل اللہ فرجہ	۱۷۵

maablib.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

انسان کو ہمیشہ سے ایک صحیح راستے کی تلاش کی خواہش رہی ہے، لیکن ہوتا یہ ہے وہ نادانی کی بناء پر غلط کو صحیح اور ٹیڑھے کو سیدھا سمجھ بیٹھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کی بجائے بتوں کی پوجا ہوتی رہی اور تقوائے الٰہی کی جگہ انسان بادشاہوں سے ڈرتا رہا ہے۔

اسلام نے انسان کو دنیا و آخرت کی فلاح کا راستہ دکھایا اور اس کے لیے نبی اکرمؐ کو نمونۂ عمل قرار دیا ہے۔ پھر آپ کے بعد خاتون جنت بی بی فاطمہ زہراؑ اور بارہ ائمہؑ بھی اسلام کی رو سے مسلمانوں کے لیے مثالی شخصیات ہیں۔

اب اگر مسلمان لوگ ان رہنماؤں کی بجائے کسی اور طرف نکل جائیں تو اس سے ان کے مقام رہنمائی میں کوئی فرق نہیں آتا اور یہ موقع ہمیشہ موجود رہتا ہے کوئی بھی طالب ہدایت ان کے دروازے پر آئے اور سعادت دارین سے مشرف ہو جائے۔

چنانچہ سید العلماء علامہ السید علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہ نے موجودہ دور کی مصروف زندگی کے پیش نظر اسلام کے ان رہنماؤں کی سیرت و سوانح پر "رہنمایان اسلام" کے نام سے ایک مختصر اور جامع کتاب لکھی جو اس سے پہلے امامیہ مشن پاکستان کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ چونکہ اب یہ نایاب ہو گئی تھی، اس لیے مصباح الہدیٰ پبلی کیشنز نے اس کو زیور طبع سے آراستہ کرنے کی عزت حاصل کی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ اس مفید کتاب سے خود بھی تازگیٔ ایمان حاصل کریں گے اور اسے دیگر مومنین تک پہنچانے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔ جزاکم اللہ

لاہور
۲۸ر نومبر ۱۹۹۰ء

ڈائریکٹر
مصباح الہدیٰ پبلی کیشنز

maablib.org

مرکز احیاء آثار برّصغیر
MAAB 1431
maablib.org

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی
سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہِ الطَّاھِرِیْنَ ۝

تمہید

رہنمایانِ اسلام کی سیرت کے مطالعہ کی ہمہ گیر اہمیت وافادیت اسلام اور انسانیت کے نقطۂ نظر سے

صحیح راستے کی تلاش انسان کی فطرت میں داخل ہے مگر ہزاروں برس گزرنے پر بھی یہ کارواں ایک متحدہ جادہ پر گامزن نہ رہ سکا۔ ان کامل رہنماؤں کی صحیح معرفت نہ ہونے کی وجہ سے جن کے پیچھے چلنا ہی اس کو اصل منزل تک پہنچانے کا ذمہ دار ہو سکتا تھا۔

ہدایت کی پیاس آدمی کو ہر چمکتے ہوئے بالو کے تختے کی طرف دوڑاتی ہے۔ وہ پانی سمجھ کر لپک جاتا ہے مگر بعد میں دھوکا کھاتا ہے۔ ضرورت ہے ایسے بے خطا انسانوں کے تعارف کی جن کی ساری زندگی میں کتنی ہی گہری نگاہ سے چھان بین کی جائے انکی بلندی کے تصور میں کوئی کمی نہیں بلکہ ترقی ہی ہوتی چلی جائے۔ یہ حقیقی "رہنمایانِ اسلام" ہی ہیں جن میں سے ہر ایک کی زندگی انسانی زندگی کی منزلِ معراج کا پتہ دیتی ہے۔

ایک "نظامِ تمدن" کی حیثیت سے اسلام کو تاریخ عالم میں جو نمایاں جگہ حاصل ہے اس کو دیکھتے ہوئے "رہنمایانِ اسلام" کی سیرت زندگی میں صرف اس مذہب کے پیروں ہی کے لیے ایک مقدس اور بابرکت ذکر سمجھ کر جاذبیت نہیں ہے بلکہ تاریخِ عالم میں تمدن و تہذیب کے ارتقاء کے نمایاں نشان ہونے کی بنا پر اسے مشترک انسانی نقطۂ نظر سے بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔

اس کے باوجود یہ افسوسناک واقعہ ہے کہ آج کل ہمارے کالجوں اور اسکولوں کے مسلمان بچے بھی جتنا دوسرے حکماء فلاسفہ کے حالات سے واقف ہیں اتنا بلکہ شاید عشر عشیر بھی اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے جانشینوں کے حالاتِ زندگی سے واقف نہیں ہیں، یہ بہت بڑی کمی ہے جس کا دور ہونا وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگیاں تمام نوعِ انسان کے لیے ایک مکمل معیارِ کمال کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اس بنا پر کہ انسانی زندگی کو اپنے راستے میں طرح طرح کے نرم اور گرم حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ہر طرح کے حالات میں اپنے فرض کو محسوس کرنا چاہیے وہ دلی خواہشوں اور طبیعت کے حوصلوں پر کتنا ہی بار ہو۔ یہی انسانیت کی روح اور اخلاق کی جان ہے، اور اس کے لیے ایسے ہی رہنماؤں کی سیرتِ زندگی کے مطالعہ کی ضرورت ہے جنھیں اپنے نفس پر قابو حاصل تھا اور جو ہر موقع پر جذبات سے نہیں بلکہ فرائض کے احساس سے کام لیتے تھے اور جنھوں نے دنیا کے سامنے ضبط، صبر و تحمّل اور ایثار کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں"

محمدؐ و آلِ محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سیرت ایک جامع انسانیت اور اخلاق کی کتاب ہے جس میں کہیں شجاعت کے مظاہرات ہیں کہیں علم کے، کہیں سخاوت کے کارنامے ہیں۔ کہیں ایثار کے، کہیں حکمت کے نمونے ہیں، کہیں علم و معرفت کے۔

چونکہ ان حضرات کو حالاتِ زمانہ یکساں نہیں ملے تھے بلکہ زمانہ کی کج رفتاری اور انقلابی چال سے ان کو مختلف حالات سے سابقہ پڑا اور ہر حالت کے اعتبار سے ان کو بہترین طرزِ عمل اختیار کرنا پڑا اس لیے نوعِ انسانی کی بہتری کے لیے ان میں سے ہر فرد کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ لازم ہے کہ بغیر اس کے انسانیت کا کوئی ایک گوشہ تشنۂ ہدایت رہ جاتا ہے۔

ان میں سے پہلی ذات حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہے جن کا اسوۂ حسنہ تمام مسلمانوں کے نزدیک واجب الاتباع ہے اور آپ کی سیرت خلقِ عظیم کا کامل مصداق ہونے کی بنا پر تمام افرادِ بشر کے لیے بلند ترین معراج ارتقاء

کی مثال ہے۔

اس کے بعد حضرت علی بن ابی طالبؑ کی شخصیت پر نظر ڈالیے تو آپ کی سیرت میں وہ ہمہ گیری ہے جو انسانوں کے کسی ایک گروہ یا کسی ایک جگہ کے رہنے والوں کے لیے مثال نہیں ہے بلکہ دنیا کا ہر آدمی آپ کی زندگی سے اپنے لیے نمونہ تلاش کر سکتا ہے۔ حالانکہ عام طور پر بڑے بڑے انسانوں کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو وہ محدود نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر نوشیروان عادل کو ایک انصاف پرور بادشاہ کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے مگر وہ سلاطین ہی کے لیے نمونہ ہے۔ رعایا کو کس طرح مل جل کر صلح و آشتی کے ساتھ رہنا چاہیے یہ سبق نوشیروان کی سیرت سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ حاتم کا نام سخاوت میں مشہور ہے مگر وقت آنے پر قوم و ملت کے لیے لڑائی کس طرح لڑی جا سکتی ہے اسے حاتم کی زندگی میں تلاش کرنا بیکار ہے، بڑے بڑے بہادروں کا نام دلاوری میں سامنے آتا ہے مگر وقت پڑنے پر مظالم کس طرح سے سہے جا سکتے ہیں، ان کی زندگی اس کو نہیں بتا سکتی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہر صفت کی مثال کے لیے ایک ایک آدمی کا نام پیش کر دیا جائے مگر ان کا مجموعہ بھی یہ نہ بتا سکے گا کہ ان صفتوں کا ایک ساتھ اجتماع کیونکر ہو سکتا ہے اور ان کا میل جول اس طریقہ پر کہ پورے طور سے ہر ایک کی مناسب حد اور موقع استعمال کو معلوم کیا جا سکے ناممکن ہے۔ اس کے لیے تو ایک واحد ایسی شخصیت درکار ہے جو اکیلی ان تمام انسانی اوصاف کا مجموعہ ہو جس نے زندگی کی ہر منزل میں قدم رکھا ہو اور ہر راستے میں اپنے قدم کے نشان چھوڑے ہوں۔ تاریخ عالم میں ایسی ہستی پیغمبر اسلامؐ کے حقیقی جانشین اور ان کے تعلیمات کی مکمل تصویر حضرت علی بن ابی طالب علیہ السّلام کی تھی جن کی زندگی میں یہ تمام پہلو یکجا ہیں اور دنیا آپ کی زندگی کے ہر رُخ پر نظر کر کے ہر موقع پر اپنی رہنمائی کے پہلو تلاش کر سکتی ہے۔

تیسری اہم زندگی دختر رسولؐ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی ہے۔ آپ کی سیرت کو ایک خاص انفرادی اہمیت حاصل ہے۔ اس بنا پر کہ اسلامی تعلیمات

نوعِ انسانی کے صرف ایک طبقہ یعنی مردوں سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ ان میں مردوں ہی کی طرح عورتیں بھی داخل ہیں۔ طبقۂ خواتین کے لیے معیاری حیثیت سے جو ذات نمونۂ عمل بن کر پیش ہوئی، وہ حضرت سیدہ عالم فاطمہ زہراؑ کی تھی، جن کی حیات طبقۂ خواتین کے لیے علمی و اخلاقی کمال کی منزل تک پہنچانے میں اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی تیرہ معصومینؑ کی زندگیاں مردوں کے لیے اس کے بعد شہزادۂ امن حضرت امام حسنؑ کی زندگی ہے جنھوں نے امن و امان اور ملّتِ اسلامیہ کی بہبودی کے لیے تاج و تخت کو ٹھکرا کر صلح پسندی کی مثال قائم کرنے کے ساتھ اپنے حکیمانہ شرائط صلح سے شریعتِ اسلام کے تحفّظ کی اس ذمہ داری کو پورا کیا جو اُن کے لیے ایک مقصدِ حیات کی حیثیت رکھتی تھی اور اس صلح کے مرحلہ کو انجام دے کر اس مجاہدۂ حق کے موقع کو قریب کیا جسے ۶۱ھ میں شہید کربلا حضرت امام حسینؑ نے انجام تک پہنچایا جبکہ انسانی زندگی کو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ایک طرف اسے اپنے بلند اخلاقی خصوصیات کو قائم رکھنے کے لیے خود اپنی نفسانی خواہشوں، حیوانی جذبوں اور جسمانی تقاضوں سے عقل کی رہنمائی اور فرض شناسی کے اصول کی پابندیوں کی خاطر جنگ کرنا پڑتی ہے اور دوسری طرف سچائی کے راستے میں جو بیرونی رکاوٹیں پیدا ہوتی رہتی ہیں ان کے مقابلہ کی ضرورت ہے۔ ماحول، رفتارِ زمانہ، ظلم و تشدد کی طاقتیں اس کو اکثر راستے سے ہٹا دینے کے لیے سیلاب کے بہاؤ، آندھیوں کے تیز جھکڑوں اور طوفان کے سخت تھپیڑوں سے دوچار کر دیتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر سختی کے ساتھ سچائی کے راستے پر قائم رہنا، جان پر کھیل جانا اور اصول سے بال بھر نہ ہٹنا ہر آدمی کا کام نہیں ہے۔ لفظی طور پر ثابت قدمی استقلال، ضبط اور صبر و تحمل کے الفاظ اخلاق کی کتابوں اور حکماء کی نصیحتوں میں بہت مل جائیں گے مگر مشکل منزلوں پر اور دشوار راستوں میں انسان کا قدم آگے بڑھانے، حوصلوں کو قائم رکھنے اور ڈگمگاتے ہوئے پیروں میں استقلال پیدا کرنے کے لیے ایک عملی نمونہ کی ضرورت ہے، ایسے رہنما کی حاجت ہے جو ایسی سخت سے سخت

منزلوں کو طے کیے ہوئے اس آزمائش کی کڑیوں کو جھیلے ہوئے، مشکلات کی گھاٹیوں اور راہ کی ناہمواریوں کو روندتے ہوئے، کامیابی کی سب سے اونچی چوٹی پر کھڑا ہوا دنیا کو آواز دے رہا ہو کہ "آؤ اور میرے نقشِ قدم پر چل کر سچائی، حقانیت اور صبر و استقلال کی اس معراج کو حاصل کرو"۔ یہ نمایاں طور پر شہید کربلا حسینؑ بن علیؑ کی ذات ہے۔

پھر ان میں زین العابدینؑ حضرت علیؑ بن الحسینؑ کی زندگی وہ ہے جس میں ایک طرف حقانیت کی راہ میں قید و بند برداشت کرنے کا نمونہ ہے اور دوسری طرف عبادت کی بلند ترین مثالیں۔ اس دور میں جب کہ دنیا مادیت کی گرویدہ ہو رہی ہے اور خدا کو بھولتی جاتی ہے بلکہ بہت کچھ بھول چکی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر زبردست کمزور کو کچل دینا چاہتا ہے۔ ہر طاقتور بے طاقت کو مٹا دینا چاہتا ہے۔ ہر اکثریت اقلیت کو پامال کر دینا چاہتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس وقت اللہ کے بندوں میں خالق کی بندگی اور سچی عبادت کا جذبہ پیدا کیا جائے کیونکہ اگر اللہ کی بندگی پیش نظر ہے تو خدمتِ خلق سے انسان غافل رہ نہیں سکتا۔ پھر طاقتور کمزور کو مٹائے گا نہیں بلکہ اپنی قوت و طاقت سے اس کا محافظ بن جائے گا۔ اکثریت اقلیت کو فنا کرنا نہیں چاہے گی بلکہ اس کے لیے سبب پناہ بنے گی۔ اس جذبۂ عبودیت کو پیدا کرنے کے لیے ان خالص بندگانِ خدا کا تذکرہ ہونا چاہیے جنھوں نے سخت سے سخت موقعوں پر بھی اللہ کی یاد کو نہیں بھلایا۔ اطمینان اور سکون سے لمحوں میں رسمی طور پر عبادت سب ہی کر سکتے ہیں اور خاطر جمعی کے عالم میں اللہ کو ماننے والے بہت سے اس کا سجدہ کر لیتے ہیں مگر مصیبتوں کی گھنگھور گھٹاؤں میں تکالیف و شدائد کے ہجوم میں مظالم کے طوفانوں میں اور باپ بھائی اور دوسرے عزیزوں کی جدائی کے بے پناہ صدموں میں ایسی عبادت کرنا کہ "زین العابدینؑ" کے نام سے زیادہ مشہور لقب ہو جاتے اور ایسے سجدے کرنا کہ "سید الساجدینؑ" خطاب ہو جاتے صرف حضرت علیؑ بن الحسین علیہ السلام سے مخصوص ہے۔

ان میں سے حضرت امام محمد باقرؑ اور جعفر صادقؑ یہ دو ہستیاں وہ ہیں جنھوں نے

علوم کے دریا بہا دیئے' ان سے پہلے خداپرستی کا وہ راستہ جسے حضرت محمدؐ عربی نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا ظلم وستم کی آندھیوں سے شبہات واوہام کی گرد میں پٹ گیا تھا۔ اگرچہ آلِ رسولؑ میں سے ہر مقدس ہستی اس تعلیم کی حفاظت کرتی رہی اور اسی لیے قربانیاں پیش ہوتی رہیں مگر سیاسی اقتدار کے شکنجوں نے زیادہ انھیں کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع نہیں دیا۔ حضرت باقرؑ و صادقؑ ان دونوں بزرگواروں کو اس وقت سیاسی حالات کی بنا پر اتنا موقع مل سکا کہ وہ رسولؐ اللہ کے گھرانے کے مقدس تعلیمات کو جو نوعِ انسانی کے سدھارنے کے ذمہ دار ہیں نمایاں اور صاف کر کے دوبارہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ نے حقانیت کی راہ میں قید کی کڑیاں جھیلیں اور مدت مدید تک سختیاں برداشت کیں اور حضرت امام رضاؑ کو جنھیں سلطنت بنی عباس کے ولی عہد بننے پر مجبور کر دیا تھا' یہ امتثال پیش کرنے کا موقع ملا کہ ابنائے دنیا کے اندر رہتے ہوئے اور دنیوی سلطنت کے ماحول اور دنیوی سیاست کے اندر قدم رکھتے ہوئے' پھر کس طرح ہر ہر قدم پر اپنے خدا کی مرضی کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اور اپنے دامن پر کسی قسم کی کوتاہی کا دھبا نہیں آنے دیا جاتا اور ہر حال میں اپنے اس بلند فریضہ کو پورا کیا جاتا ہے جس کے لیے انسان دنیا میں بھیجا گیا ہے۔

حضرت امام محمدؐ تقیؑ کی عمر معصومینؑ میں سب سے مختصر ہوئی آپ نے اپنی زندگی سے ثابت کر دیا کہ کوئی زندگی اگر نوع انسانی کے لیے صحیح نمونہ بن کر سامنے آئی ہو تو چاہے وہ بہت کم وقت میں ختم ہو جائے مگر اس کے پائدار نقش جو انسانی دماغوں پر قائم ہو گئے ہیں کبھی نہیں مٹتے اور باوجود اپنے مختصر ہونے کے نتیجہ کے لحاظ سے اور افادیت پر نظر کرتے ہوئے تاریخ انسانی کا وہ اتنا ہی اہم باب قرار پاتی ہے جتنا زیادہ عمر کو حاصل کر کے کسی انسان کی زندگی ہو سکتی ہے۔

حضرت امام علی نقیؑ اور حسن عسکریؑ کی زندگیاں بھی انہی تمام خصوصیات کی حامل ہیں جو جلاوطنی اور قید و بند میں گزریں' مگر علوم واحکام آلِ محمدؐ کی اشاعت کے کام کو

جاری رکھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام "خیالی عقائد" کا مجموعہ نہیں تھا وہ اس دنیا کے جیتے جاگتے انسانوں کے لیے اس حیات کی کش مکش میں عمل کا صحیح راستہ دکھانے کے لیے آیا تھا۔ وہ راستہ جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے اس اعتبار سے کہ وہی طریق کار جو ایک حال میں درست ہے ایک دوسری مختلف صورت حال میں وہی نادرست ہو جاتا ہے اس لیے ضرورت تھی کہ زندگی کے ہر امکانی انقلاب میں صحیح عمل کے نمونے پیش ہو جائیں کیونکہ انہی انقلاب میں انسانی کردار کے دوراہے آتے ہیں اور ہر موڑ پر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ راستہ صحت کی طرف جا رہا ہو یا غلطی کی طرف یہ مقصد نہ صرف زبانی تعلیم سے پورا ہو سکتا تھا اور نہ کسی ایک رہنما کی سیرت زندگی سے۔

اس مقصد کی تکمیل کے لیے قدرت نے "رہنمایانِ اسلام" کی چودہ ہستیوں کو یکے بعد دیگرے پیدا کیا جن کا مجموعی دور اس عالم میں چشمِ مشاہدہ کے سامنے تین سو برس کے قریب رہا۔ ان تین سو برس میں تیز و تند ہوائیں بھی چلیں، سخت سے سخت طوفان بھی آتے اور انتہائی شدید زلزلے بھی تمدن، سیاست، ماحول اور حالات نے طرح طرح کی کروٹیں بدلیں رنگ رنگ کے تغیرات ہوئے، ان میں سے ہر منزل میں آلِ محمدؑ میں سے ایک معصوم ذات نے خلقِ خدا کے سامنے اپنا اسوۂ حسنہ پیش کیا اور صحیح راستہ نگاہ کے سامنے نمایاں کر دیا۔

یاد رہے کہ تاریخ کی مختلف صدیاں اپنے انقلابات میں تقریباً یکساں سے نمونے پیش کیا کرتی ہیں وہی چند اوراق ہیں جو شکلیں بدل بدل کر آنکھوں کے سامنے آتے ہیں مگر روحِ حقیقت ان کی یکساں ہوتی ہے۔

ذرا سی دانائی و بینائی اور ذرا سے گوش و ہوش کی ضرورت ہے۔ پھر حالات اور ان کے تقاضے کی یکسانی کا اندازہ کرنا زیادہ دشوار نہیں ہے۔

آلِ محمدؑ نے ڈھائی سو برس کے اندر مختلف انقلابات میں اپنے عمل

کے جو نقوش چھوڑ دیئے ہیں ان کے بعد دنیا کا کوئی ماحول کوئی انقلاب یا کوئی ہنگام ایسا نہیں ہے جس میں انسان اپنے فریضہ کی تعیین میں روشنی محسوس نہ کرے۔

شرط یہ ہے کہ ان کی سیرت کے نقوش آنکھوں کے سامنے آتے رہیں۔

MAAB 1431
مرکز احیاء آثار برّ صغیر
maablib.org

حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نام ونسب

حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی اولاد میں ایک فرزند اسحٰقؑ کی اولاد سے بنی اسرائیل تھے جن میں حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور بہت سے دوسرے پیغمبر ہوئے اور دوسرے فرزند اسمٰعیلؑ کے بارہ بیٹوں میں قیدار کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی تھی جن میں عدنان سب سے زیادہ مشہور تھے پیغمبر اسلامؐ ان ہی کی اولاد میں سے تھے۔

آپ کا نسب نامہ عدنان تک اس طرح ہے۔

محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدالمناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

ان میں سے نضر بن کنانہ کی اولاد قریش کہلاتی تھی۔ حضرت کی والدہ آمنہؑ بنت وہب بن عبدالمناف بن زہرۃ بن کلاب بن مرہ تھیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ حضرت ماں اور باپ دونوں طرف سے قریش کے ممتاز قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔

ولادت

۵۷۰ء میں جس سال ابرہہ حبشی نے خانۂ کعبہ پر ہاتھیوں کی فوج کے ساتھ فوج کشی کی ہے جس سے عربوں نے عام الفیل کے نام سے سنہ مقرر کرلیا۔ اسی سال جمعہ کے دن ۱۷، ربیع الاول کو حجاز کی سرزمین مکہ پر حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت ہوئی۔

maablib.org

یتیمی

تاریخی حیثیت سے یہ مسلّم ہے کہ حضرتؐ کے سر پر باپ کا سایہ دنیا میں باقی نہیں رہا۔ آپؐ کے والد جناب عبد اللہؑ کا انتقال ہو گیا اسی وقت جب آپ ابھی ماں کے پیٹ میں تھے، یا پیدا ہونے کے بعد آپ دو مہینے یا سات مہینے کے تھے یا زیادہ سے زیادہ دو برس یا دو برس اور چار مہینے، یہ آخری مدت ہے۔ بہر حال مورخین میں اس کی تعیین میں اختلاف ہے جس میں کوئی قابلِ اطمینان فیصلہ دشوار ہے۔ صورت حال کی حسرت خیزی اور بڑھ جاتی ہے اس سے کہ چھ سال کی عمر جب ہوئی تو شفیق ماں کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کی مرضی یہی تھی کہ تمام عالم کو اپنی محبت و شفقت کے سایہ میں جگہ دینے والا خود باپ اور ماں دونوں کے سایۂ عاطفت سے کم سنی ہی میں محروم ہو جائے۔

تربیت

قبیلۂ بنی سعد میں حلیمہ وہ خوش قسمت خاتون تھیں جو رسول اللہؐ کی رضاعت (دودھ پلانے) کے لیے مقرر ہوئیں اور اس دوران میں انھوں نے آپؐ کو اپنے گاؤں میں رکھا۔ اس کے بعد چھ برس کے سن تک آپ اپنی والدہ گرامی کے ساتھ رہے۔ جب ماں کا بھی سایہ سر سے اُٹھ گیا تو آپ کے دادا عبد المطلب نے آپؐ کو اپنے پاس بُلا لیا اور اپنی اولاد میں سب سے زیادہ محبت و شفقت کے ساتھ آپ کی پرورش شروع کی مگر دو برس کے بعد جناب عبد المطلب کی بھی وفات ہو گئی۔ انھیں اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں فکر تھی تو اس بچہ کی حفاظت و نگہداری کی جس کے متعلق انھیں یقین تھا کہ آگے چل کر دنیا کے سامنے اس کا بہت بڑا مرتبہ نمایاں ہوگا اس لیے جب اپنی زندگی سے بالکل مایوسی ہو گئی تو انھوں نے اپنے فرزند ابو طالبؑ کو بلا کر محمدؐ کو ان کے سپرد کر دیا۔ دوسرے بھائی سن میں ان سے بڑے

موجود تھے مگر عبدالمطلب کی نگاہ دوربین دیکھ رہی تھی کہ محمدؐ کے لیے جس طرح ابوطالبؑ جان نثاری کے ساتھ خدمات انجام دیں گے اس طرح کوئی دوسرا انجام نہیں دے گا۔

چنانچہ ابوطالبؑ نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک ہر طرح کے سخت سے سخت اوقات میں محمد مصطفےٰؐ کی نصرت وحمایت میں اس عہد کو پورا کیا جو وہ اپنے بزرگ مرتبہ باپ عبدالمطلب سے ان کی اکھڑی ہوئی سانسوں کی آخری آمدورفت کے عالم میں کر چکے تھے اور اس وقت سے کہ جب رسولؐ آٹھ برس کے تھے اپنی زندگی بھر رسولؐ کے ساتھ آپ کے چچا ابوطالبؑ وہ محبت صرف کرتے رہے جو اپنی اولاد کے ساتھ صرف نہ کرتے تھے اور چچی فاطمہؑ بنت اسد وہ شفقت کرتی تھیں جس سے رسولؐ کو ماں کی محبت کا لطف حاصل ہو جاتا تھا، اس لیے آپ نے چچی فاطمہؑ بنت اسد کے انتقال کے موقع پر یہ الفاظ فرمائے کہ "یہ میری ماں کے بعد میری ماں کا درجہ رکھتی تھیں"۔

شام کا پہلا سفر

جب حضرتؐ کی عمر بارہ برس کی تھی تو ابوطالبؑ نے تجارت کے لیے شام کی جانب سفر کیا۔ اس سفر میں آپؐ بھی اپنے چچا کے ساتھ گئے اور اسی ذیل میں بحیرا راہب نے آپ کو دیکھ کر ان آثار کی بنا پر جو گذشتہ آسمانی کتابوں میں مذکور تھے، کہا کہ یہ بچہ نبی ہونے والا ہے اور اسے بڑا اقتدار حاصل ہوگا یہ ملاقات بحیرا سے اثنائے راہ میں تھوڑی دیر کے لیے ہوئی تھی کوئی غلط روایت بھی اس کا پتہ نہیں دیتی کہ آپ نے وہاں کچھ عرصہ تک قیام کیا ہو۔

حلف الفضول میں شرکت

جب آپ کی عمر بیس سال کی تھی تو قریش میں حلف الفضول کا عہدنامہ ہوا کہ جو بے نظیر شریفانہ اصولوں پر مبنی تھا۔ عبدالمطلب کے انتقال کے بعد قبائل عرب میں

مطلق العنانی اور بے آئینی پیدا ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ پردیسیوں کے جان و مال مکہ میں محفوظ نہ رہے تھے۔ اس لیے بنی ہاشم کی دعوت پر زہرہ اور تیم کے قبیلے بھی متفق ہوئے اور سب نے عبداللہ بن عدنان کے مکان پر جمع ہو کر یہ عہد کیا کہ "ہم ہمیشہ مظلوم کا ساتھ دیں گے اور اس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک کہ اس کی شکایت رفع نہ ہو جائے اور ہم ایک دوسرے کی حق کوشی میں معاونت کریں گے۔" اس معاہدہ میں حضرت محمد مصطفےٰ ؐ نے بھی شرکت فرمائی یہاں تک کہ ظہور اسلام کے بعد جب عرب کے دوسرے زمانہ جاہلیت کے معاہدات کالعدم کر دیئے گئے تھے تو بھی آپ اس معاہدہ کا اپنے کو پابند سمجھتے ہوئے فرماتے تھے کہ آج بھی اگر کوئی مجھے اس معاہدہ کی بنا پر آواز دے تو میں اس کی آواز پر لبیک کہوں گا۔

سفرِ تجارت

رسول ؐ کی عمر پچیس سال کی تھی جب آپ خدیجہ ؑ بنت خویلد کے اموال تجارت کو لے کر شام کی طرف گئے یہ تجارت کی مہم اتنی کامیابی کیساتھ انجام پائی کہ جتنا نفع ہر سال خدیجہ ؑ کو ہوا کرتا تھا اس سے دُونا نفع اس سال ان کو حاصل ہوا۔

شادی

تجارتی معاملات کے ذیل میں رسول اللہ ؐ کے محاسنِ اخلاق، امانت و دیانت اور بلندی ذات و صفات کا جناب خدیجہ ؑ کے دل پر نہایت گہرا اثر پڑا اور خود جناب خدیجہ ؑ کے حسن معاملت اور کردار کا رسول ؐ خدا کی نظر میں بھی وزن تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب آپ ؐ کو جناب خدیجہ ؑ کے ساتھ شادی کے پیغام دینے کی طرف متوجہ کیا گیا تو آپ ؐ نے صرف یہ عذر فرمایا کہ خدیجہ ؑ کافی مالدار ہیں، میری اتنی مالی حیثیت نہیں ہے کہ میرے ساتھ وہ شادی پر تیار ہو سکیں لیکن درمیانی شخص نے جب ان کے رضامند ہونے کی ذمہ داری لی تو آپ ؐ نے بخوشی پیغام دینا پسند فرمایا

وہی ہوا کہ جناب خدیجہؑ نے اسے فوراً منظور فرمالیا چنانچہ تاریخ عقد مقرر ہوئی جناب خدیجہؑ کی طرف سے ان کے چچا عمرو بن اسد نے اور حضرتؐ کی جانب سے آپ کے چچا ابو طالبؑ نے خطبۂ عقد اور ایجاب و قبول کے مراسم ادا کیے۔ باوجودیہ کہ جناب خدیجہؑ عمر میں حضرتؐ سے کافی زیادہ تھیں مگر ان کے حسنِ سیرت کی آپؐ کی نظر میں اتنی عزت تھی کہ آپؐ نے ان کی زندگی میں کسی دوسری عورت سے عقد کا تصور بھی نہیں فرمایا۔

سیرت کی بلندی

بچپن سے جوانی تک کی زندگی کے تجربات نے عربوں پر یہ اثر کیا کہ انھوں نے متفقہ طور پر آپ کی راست بازی اور امانت داری کو تسلیم کرلیا اور آپ کو صادق اور امین کے القاب سے یاد کرنا اور اپنی امانتوں کو آپ کے پاس رکھوانا شروع کردیا۔ اس کے علاوہ اہم معاملات میں آپ کے مشوروں کو قابلِ قبول سمجھنے لگے چنانچہ خانۂ کعبہ کی مرمت کے موقع پر حجرِ اسود کے نصب کرنے کی عزت حاصل کرنے کی کوشش میں مختلف قبیلوں کے درمیان جو تنازع کی صورت ہوگئی تھی وہ آپ ہی کے حکیمانہ فیصلہ سے دور ہوئی اور سب نے اس کو بخوشی تسلیم کرلیا۔

بعثت

حضرتؐ کی عمر چالیس برس کی تھی جب آپ ۲۷ رجب کو تبلیغ رسالت کے فریضے پر مامور ہوئے اور عملی طور پر خداوندی پیغام کے حامل قرار پائے۔ آپ نے بحیثیت رسولؐ اپنے پیغام کو سب سے پہلے اپنی رفیقۂ حیات خدیجہؑ بنت خویلد تک پہنچایا۔ جس پر وہ سچے دل سے ایمان لائیں اور آپ کے چچازاد بھائی علیؑ ابن ابی طالبؑ جو برابر آپ کے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور آپ کی رسالت کی عظمتوں کے پہلے سے عینی شاہد تھے۔ آپ کے دعوائے رسالت کے سب سے پہلے گواہ بنے۔

پھر روز بروز دوسرے افراد تک بھی یہ آواز پہنچتی گئی اور اکا دکا لوگ آپ کے دعوے پر ایمان لاتے رہے مگر ابھی تک تبلیغِ رسالت رازداری کے ساتھ خاص خاص لوگوں کے سامنے کی جاتی تھی اور علی الاعلان اپنی آواز کو بلند کرنے کا موقع نہ آیا تھا جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے انھیں بھی حکم یہی تھا کہ وہ مخفی طور پر اپنے فرائض مذہبی انجام دیں اور اس کی عام اشاعت نہ کریں۔

دعوتِ عشیرہ

تین برس اسی طرح رازداری کے ساتھ فرضِ تبلیغ ادا ہونے کے بعد دوسری منزل یہ تھی کہ اپنے قریبی عزیزوں کے مجمع میں اعلان کا حکم آیا آپ نے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کو حکم دیا کہ دعوت کا سامان کرو، چنانچہ سامان کیا گیا اور اس میں تمام قریش کے ممتاز افراد کو مدعو کیا گیا۔ سب جمع ہوئے، کھانے کے بعد حضرتؐ نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دنیا اور آخرت دونوں میں بہتری کی ضامن ہے۔ میں خلقِ خدا کو توحید اور اصلاحِ عمل کی طرف بلانے پر مامور ہوں۔ تم میں سے کون ہے جو اس مہم میں میرا ساتھ دے گا تاکہ وہی میرا رفیق، میرا وصی، اور میرا خلیفہ ہو۔ مجمع میں ایک سناٹا سا چھا گیا۔ کسی نے کچھ جواب نہ دیا مگر بس ایک جوان بخت بچہ تھا جو اٹھ کھڑا ہوا اور کہا میں آپ کا اس مہم میں دست و بازو ہوں گا۔ یہ علیؑ بن ابی طالبؑ تھے جو عملی طور پر پہلے ہی سے رسولؐ کے بازو بنے ہوتے تھے اور اب اس طرح وہ تمام مجمع کے سامنے بھی عہدِ وفاداری کر رہے تھے۔ پیغمبرؐ نے علیؑ کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ بس یہ میرا رفیق، میرا وصی اور میرا خلیفہ ہے۔

مصائب و شدائد

رسولؐ نے قریش کے سامنے علانیہ بُت پرستی کی مذمت اور خدا پرستی کی تبلیغ شروع کر دی۔ قریش آپ کی ایذا رسانی پر آمادہ ہوئے مگر ابو طالبؑ کی شخصیت سے جو

آپ کی محافظ تھی وہ مجبور ہو رہے تھے۔ آخر ان میں سے جو ممتاز افراد تھے وہ مل کر ابو طالبؑ کے پاس آئے اور بہت تلخ الفاظ میں رسولؐ کی شکایت کی اور کہا کہ یا تو اپنے بھتیجے کو روکئے یا آپ درمیان سے ہٹ جائیے ہم ان سے سمجھ لیں گے۔ ابو طالبؑ نے حضرتؐ سے اس کا تذکرہ کیا آپ نے فرمایا کہ یہ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند رکھ دیں تب بھی میں کلمۂ حق سے خاموش نہیں ہو سکتا۔ ابو طالبؑ نے ان لوگوں کو صاف جواب دے دیا جس سے ان کی عداوت کا شعلہ اور زیادہ بھڑک گیا اور خصوصیت کے ساتھ ان غریب مسلمانوں کو بہت تکلیف پہنچانے لگے جنھوں نے رسالتِ پیغمبرؐ پر ایمان قبول کیا تھا۔

ہجرتِ اولیٰ

بعثت کے پانچویں سال مسلمانوں پر مظالم بہت ہونے لگے تو آپؐ نے اپنے اصحاب کو ملک حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی ہدایت فرمائی چنانچہ کافی تعداد میں مسلمان حبشہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ان مہاجرین کے سرگروہ جعفر بن ابی طالبؑ تھے جنھوں نے بہترین طریقہ پر عیسائی بادشاہ کے دربار میں اسلامی تعلیمات کی ترجمانی اور تبلیغ کا فرض بھی انجام دیا جس سے بادشاہ اور ارکانِ سلطنت کے دل پر اسلامی عظمت کا سکہ جم گیا اور مسلمانوں کو وہاں اطمینان و سکون کے ساتھ قیام کا موقع ملا۔

محاصرہ

حبشہ میں مسلمانوں کی کامیابی کے حالات سن کر مشرکین کے بغض و حسد میں اور ترقی ہوئی اور انھوں نے آپس میں متفق ہو کر یہ طے کیا کہ بنی ہاشم کا پورے طور پر بائیکاٹ کیا جائے، نہ صرف یہ کہ ان کے ساتھ شادی بیاہ جائز نہ سمجھا جائے بلکہ ان کے ساتھ خرید و فروخت بھی نہ کی جائے۔ یہاں تک کہ ضروریاتِ زندگی پانی اور کھانا تک پہنچنے نہ دیا جائے۔ ناچار ابو طالبؑ نے رسولؐ کو اپنے ایک محفوظ مکان میں

جو پہاڑ کی گھاٹی میں ایک قلعہ کی صورت پر تھا منتقل کر دیا۔ یہ واقعہ رسالت کے ساتویں سال کا ہے اور تین برس مسلسل یہ محاصرہ قائم رہا۔ اس دوران میں حضرت رسولؐ خدا اور آپ کے ساتھ تمام بنی ہاشم کو سخت تکالیف و شدائد کا مقابلہ کرنا پڑا یہاں تک کہ کبھی کبھی وقت ایسے گزر جاتے تھے کہ آب و طعام میسّر نہ آتا تھا تین برس کے بعد یہ بائیکاٹ ختم ہوا اور یہ لوگ قلعہ سے باہر نکل سکے۔

دو بڑے صدمے

افسوس ہے کہ اس محاصرہ کے ختم ہونے سے دو ہی مہینے کے بعد بعثت کے دسویں سال ابو طالبؑ کا اور ان کے صرف پینتیس دن بعد خدیجہؑ بنت خویلد کی وفات ہوگئی۔ ان دونوں شخصیتوں کی رحلت کا رسول اللہؐ کو شدید صدمہ پہنچا۔ اسی سے آپؐ اس سن کو "عام الحزن" (رنج کا سال) فرمایا کرتے تھے۔

طائف کا سفر

ابو طالبؑ کے بعد قریش کی ایذا رسانی بہت بڑھ گئی وطن کی زمین رسولؐ کے لیے خارزار بن گئی۔ آپ کو اسلام کی اشاعت کے لیے اب کسی مناسب مقام کی تلاش بھی تھی، چنانچہ آپ نے بعثت کے دسویں برس کے آخر میں ایک پناہ گزین کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک داعی حق کی حیثیت سے طائف کا سفر کیا۔ بالکل بے زاد و بے توشہ صرف زید بن حارثہ کو ساتھ لیے ہوئے آپ نے عرب کے اس سرسبز مقام پر دس دن قیام کیا اور فرداً فرداً اسلام کا پیغام ہر ایک تک پہنچایا مگر افسوس کہ ہدایت کی کھیتی کے لیے یہ شاداب زمین بھی اوسر ثابت ہوئی نہ صرف یہ کہ ان لوگوں نے آپ کی آواز پر لبیک نہیں کہی بلکہ اپنے یہاں ٹھہرنے بھی نہیں دیا اور جسم مبارک پر پتھر مارنا شروع کیے۔ آپ پھر مکہ معظمہ واپس آئے مگر یہ تمام مشکلات آپ کے قدم کو راہِ حق میں مسلسل کوشش سے باز نہ رکھ سکیں۔

انصار کی ملاقات

مکہ معظمہ میں ہر سال مجنہ اور عکاظ کے جو بازار لگتے تھے اور ان میں مختلف اطراف وجوانب کے قبائل جمع ہوتے تھے اس موقع پر شعرائے عرب اپنے قصیدے سناتے تھے۔ تجار اپنے اموالِ تجارت لاکر فروخت کرتے تھے اور رسولؐ کا کام یہ تھا کہ آپ قبائل عرب کے سامنے اپنے پیغامِ توحید کو پیش کر کے ان کو اپنی حمایت و نصرت کی دعوت دیتے تھے مگر دعوتِ حق کی آواز ان ہی دلوں پر اثر کیا کرتی ہے جن میں کسی حد تک صلاحیت و قبول کی روشنی موجود ہوتی ہے۔ جبکہ اکثر قبائلی بجائے وعدۂ نصرت کے حضرتؐ کی باتوں کا مذاق اڑاتے تھے اور ایذارسانی پر آمادہ ہوتے تھے۔ یثرب کی سرزمین کی ایک جماعت خوش قسمتی سے اس صدا سے متاثر ہوگئی اور انھوں نے عقیدۂ حق کو قبول کر کے آپ کی امداد و نصرت کا وعدہ کر لیا۔ یہ تھا انصار کا پہلا گروہ جو شرفِ اسلام سے مشرف ہوا اور پھر انھوں نے اپنے شہر جاکر رسولؐ کا پیغام پہنچایا اور بہت سے افراد نے غائبانہ آپ پر ایمان اختیار کیا۔ دوسرے سال ان میں کے بارہ آدمی رسولؐ سے آکر ملے اور آپ سے عقائدِ اسلامیہ کی تعلیم حاصل کی اور تیسرے سال ستّر آدمیوں نے حاضر ہوکر اس سعادت کو حاصل کیا۔ اب مدینہ میں اسلام کافی طور پر پھیل گیا اور لوگ جوق در جوق مسلمان ہونے لگے۔ جن میں سے اکثر صرف تعلیماتِ اسلامی سے متاثر ہوکر اس سعادت کو حاصل کر رہے تھے اور ابھی ان کو آنکھوں سے رسولؐ کے چہرۂ مبارک کی زیارت نصیب نہ ہوئی تھی۔

مدینہ کی طرف ہجرت

یثرب میں اسلام کی کامیابی کی خبریں سن سن کر اہلِ مکہ کا غیظ و غضب بڑھتا جاتا تھا اور وہ اب مسلمانوں کو اور زیادہ ناقابلِ برداشت تکلیفیں پہنچانے لگے۔ آخر رسولؐ خدا نے ان کو یثرب کی جانب ہجرت کی اجازت دی اور رفتہ رفتہ اکثر مسلمان مکہ سے نکل گئے۔

صرف رسولِ خدا علی المرتضیٰؑ اور چند دوسرے مسلمان باقی رہ گئے اب مشرکین کو یقین ہوگیا کہ رسالت مآبؐ کے لیے یثرب میں ایک محفوظ جائے پناہ حاصل ہوگئی ہے۔ اب عنقریب یہ خود بھی وہاں پہنچ جائیں گے تو ہمارے مقابلہ میں ان کو بڑی طاقت حاصل ہو جائے گی، اس لیے دارالندوہ میں جمع ہوکر آپس میں مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ رات کے وقت آپ کے گھر کو گھیر کر آپ کے چراغِ زندگی کو خاموش کر دیا جائے۔

حضرت رسولؐ کو اس کی اطلاع پہنچ گئی اور آپ نے طے فرمالیا کہ آپ اپنے بستر پر علیؑ ابن ابی طالبؑ کو لٹا کر خود مخفی طریقہ سے زمین مکہ کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف روانہ ہو جائیں، چنانچہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے اپنے کو خطرے میں ڈال کر رسولؐ کے بستر پر آرام کیا اور حضرت دشمنوں کی نگاہوں سے مخفی رہ کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس اہم واقعہ کو ہجرت کہتے ہیں اور اسی سے مسلمانوں میں ہجری تاریخ کی ابتدا ہوئی ہے جسے اس وقت تک چودہ سو دس برس ہو چکے ہیں۔

مسجد نبوی کی تعمیر

سب سے پہلا کام جو رسولؐ نے مدینہ پہنچ کر کیا وہ مسجدِ نبوی کی تعمیر تھی جس میں تمام مسلمانوں کے ساتھ خود رسولؐ بھی پتھر اٹھا اٹھا کر لانے میں شریک تھے۔ شروع شروع میں بس ایک قد آدم اونچی چار دیواری پر اکتفا کی گئی پھر جب نمازیوں کو گرمی سے تکلیف ہوئی تو شاخہائے درخت کا ایک سائبان ڈلوادیا لیکن چھت باوجود اصحابؓ کے اصرار کے بنوانا پسند نہیں فرمائی۔ اس مسجد کے گرد چھوٹے چھوٹے مکانات اپنے اعزا اور ضرورت مند اصحابؓ کے لیے بنوائے جن کے دروازے پہلے مسجد ہی میں کھلتے تھے مگر بعد کو سوائے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے اور سب کے دروازے مسجد کی طرف بند کر دیئے گئے اور آمد و رفت باہر سے قرار دے دی گئی۔

جہاد

جب قریش کو معلوم ہوا کہ رسولؐ بخیر و خوبی مدینہ پہنچ گئے اور ان کا مذہب دن دونی ترقی کر رہا ہے تو ان کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی اور وہ مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ مل کر کوشش کرنے لگے کہ اس بڑھتی ہوئی طاقت کو کچل دیں۔ اس کے نتیجہ میں حضرت محمدؐ کو مشرکینِ قریش اور یہودیوں کے ساتھ بہت سی لڑائیاں لڑنی پڑیں جن میں سے اہم موقعوں پر حضرتؐ خود فوجِ اسلام کے ساتھ تشریف لے گئے۔ ایسی مہموں کو "غزوہ" کہتے ہیں اور جن موقعوں پر آپ اپنے اصحابؓ میں سے کسی کو فوج کا سردار بنا کر بھیج دیا کرتے تھے ان کو "سریہ" کہا جاتا ہے۔ غزوات کی مجموعی تعداد چھبیس ہے جن میں بدر، احد، خندق، خیبر اور حنین بہت مشہور ہیں اور سریوں کی تعداد چھتیس تھی۔ جن میں سب سے مشہور جنگ موتہ ہے جس میں جعفر طیارؑ شہید ہوئے۔

صلح حدیبیہ

بدر و احد کی لڑائیوں کے بعد کچھ عرصہ تک مشرکین مکہ کی طرف سے کوئی جنگی کاروائی نہیں ہوئی، تو ہجرت کے چھٹے سال حضرت نے مکہ معظمہ کے حج کا ارادہ کیا اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوئے مگر جب قریشیوں کو رسولؐ کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ مکہ سے باہر نکل کر رسولؐ کا راستہ روکنے پر تیار ہوئے اور انھوں نے کہا کہ ہم اپنی آنکھوں سے آپ کا شہر مکہ میں ورود نہیں دیکھ سکتے۔ مکہ والوں کا یہ جارحانہ اقدام دیکھ کر رسولؐ نے امن پسندی سے کام لیتے ہوئے ان کے ساتھ ایک تحریری صلح نامہ کر دیا۔ اس صلح کے کاتب حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ تھے۔ اس کے شرائط حسب ذیل تھے۔

۱۔ رسولؐ اس سال مع اپنے اصحاب کے بغیر حج کیے ہوئے واپس جائیں۔

maablib.org

۲۔ دس سال تک آپس میں کوئی جنگ نہ ہو۔

۳۔ اگر مکہ والوں میں سے کوئی جاکر مسلمانوں میں شامل ہو جائے تو مسلمانوں کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اسے واپس کردیں۔

۴۔ اگر کوئی مسلمان بھاگ کر مشرکین کے پاس آجاتے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

۵۔ عرب کے تمام قبیلوں کو اختیار ہے کہ چاہے وہ رسولِ اسلامؐ کے ساتھ معاہدہ کرلیں یا مکہ والوں کے ساتھ ہو جائیں۔

۶۔ سالِ آئندہ مسلمانوں کو مکہ کی زیارت کا حق حاصل ہوگا لیکن وہ وہاں تین روز سے زیادہ قیام نہیں کرسکیں گے۔

۷۔ مسلمان اس موقع پر اپنے سفری اسلحہ کے ساتھ یعنی تلواروں کو غلاف میں رکھ کر آسکیں گے۔

بعض مسلمان اس معاہدہ کے غیر منصفانہ شرائط پر بڑی ناراضگی کا اظہار کر رہے تھے۔ مگر حضرت رسولؐ نے اس لیے کہ جارحانہ حملہ کا الزام آپ پر عائد نہ ہو۔ ان شرائط پر صلح کر کے مکہ سے واپس چلے آئے اور اگلے سال معاہدہ کے مطابق حج کے لیے تشریف لے گئے اور حسب معاہدہ تین دن کے بعد مکہ کو چھوڑ دیا اور مدینہ واپس چلے آئے۔

فتح مکہ

کچھ ہی عرصہ کے بعد مکہ والے اس معاہدہ پر جو رسول اللہؐ کے ساتھ کیا گیا تھا قائم نہیں رہے اور قبیلۂ خزاعہ کو جو پیغمبر اسلامؐ کا حلیف تھا بکر کے قبیلہ نے جو مشرکین کا حلیف تھا تہ تیغ کردیا۔ جب حضرتؐ کو یہ معلوم ہوا تو آپ اپنے حلیف قبیلہ کی امداد کے لیے فوراً روانہ ہوگئے اور دس ہزار مسلمانوں کی فوج کے ساتھ مکہ کے قریب پہنچ کر خیمہ زن ہوئے۔ مشرکین میں اب مقابلہ کی طاقت باقی نہ تھی۔ انھوں نے ہتھیار ڈال دینا مناسب سمجھا اور ماہِ رمضان ۸ھ میں آپؐ فاتحانہ شان سے مکہ معظمہ میں

داخل ہوئے۔ اب پیغمبرؐ اسلام کا رحم و کرم دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے کہ ان لوگوں کی جن سے آپ کو سخت تکلیفیں پہنچی تھیں۔ جن کی وجہ سے آپ کو اپنا وطنِ عزیز چھوڑنا پڑا تھا۔ فتح مکہ کے وقت تمام خطائیں معاف کر دی گئیں۔ فتح کے موقع پر جب لوگ آپؐ کی بیعت کر رہے تھے تو آپؐ نے ان سے پوچھا کہ بتاؤ تم مجھ سے کیا امید رکھتے ہو۔ سب نے جواب دیا کہ ہمیں اچھائی ہی کی امید ہے۔ آپؐ فیاض بھائی ہیں اور فیاض بھائی کے فرزند ہیں۔ آپؐ نے فرمایا جاؤ تم لوگ آزاد ہو۔

دنیا کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ رسولؐ خدا نے ابوسفیان کو اس کی بیوی ہندہ کو جس نے حضرت حمزہؓ کی شہادت کے بعد ان کا کلیجہ نکلوا کر چبایا تھا، وحشی کو جس نے حمزہؓ کو شہید کیا تھا عکرمہ ابوجہل کے بیٹے اور ایسے ہی کئی اشخاص کو جنھوں نے سخت ایذائیں پہنچائی تھیں اور شدید جرائم کے مرتکب ہوئے تھے۔ آج ظاہری اسلام قبول کرنے کے بعد بغیر کسی شرط کے معاف کر دیا۔ فتح کے بعد حضرتؐ نے ڈیڑھ ماہ مکہ میں قیام فرمایا اور ملکی انتظام کے لیے وہ اصول جاری کیے جو مہذب قوموں کی تہذیب کی آج بھی نشانی بن سکتے ہیں۔

حجۃ الوداع

۱۰ھ میں حضرت نے اپنی زندگی کا آخری حج کیا۔ ہزاروں مسلمانوں کے ساتھ بڑی شان و شوکت کے ساتھ ارکانِ حج ادا کیے۔

واپسی میں مقامِ غدیر خم پر تمام اطراف و جوانب کے مسلمانوں کے مجمع میں یادگار تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں آپؐ نے اپنی وفات کے قریب ہونے کی دردناک خبر سناتے ہوئے ان سے اس طرح اقرار لیا کہ میں تمھارے بارے میں خود تم سے زیادہ اختیارات رکھتا ہوں یا نہیں جب سب نے تسلیم کیا کہ بے شک آپؐ ہم پر ہم سے زیادہ اختیارات رکھتے ہیں تو آپؐ نے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کا ہاتھ پکڑ کر مجمع کے سامنے اونچا کیا اور فرمایا کہ جو اختیارات مجھے تمھاری نسبت حاصل

ہیں وہی علیؑ کو تمھاری نسبت حاصل ہوں گے اس طرح آپؐ نے اپنے بعد کے لیے جانشین کے نام کا اعلان فرمایا۔ مسلمانوں نے اس پر بڑی خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا اور عام طور سے اس وقت علیؑ رسولؐ کے جانشین تسلیم کر لیے گئے۔

اصولِ تعلیم اور اخلاق و خصائل

پیغمبر اسلامؐ کی تعلیم کا خاص جوہر تمام افرادِ انسانی کی نگاہ کو مادیت کے احاطہ سے نکال کر ایک غیبی طاقت کی طرف متوجہ کرنا تھا جس کے لحاظ سے تمام افراد انسانی یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ خالق کی توحید اور خلائق کا اتحاد یہی دو وہ بنیادی اصلیں تھیں جن پر حقوق اللہ اور حقوق الناس کی عمارت بلند ہوئی اور تاریخ انسانی میں پہلے پہل شہری اور انسانی حقوق پورے طور پر عام انسانوں کو بالعموم عطا ہوئے جن سے وہ قومیت، رنگ، جنس یا غربت و فلاکت کی بنا پر محروم رکھے جاتے تھے۔ اس نے پہلے کے تمام تفوق اور بلندی کے امتیازات مٹا کر ایک نیا امتیاز کا معیار قائم کیا اور وہ یہ کہ افضلیت اعمال و افعال کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔ جو شخص فرائضِ انسانی کو سب سے زیادہ انجام دیتا ہو وہ سب سے بہتر ہے۔

اخلاق پر بہت زیادہ زور دیا، حضرتؐ فرماتے تھے کہ "میں بھیجا گیا ہوں صرف اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے" آپؐ کے ذاتی اخلاق و خصائل بھی اسی مقصد کے ترجمان تھے۔ آپؐ اتنی بڑی اسلامی جماعت کے سردار ہوتے ہوئے فقرائے مدینہ کے ساتھ زانو سے زانو ملا کر بیٹھتے اور ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاتے تھے۔ رات رات بھر عبادت خدا ہوتی تھی اتنی کہ پیروں پر ورم آجاتا تھا اور دن بھر قبائل عرب اور مختلف شہروں کے وفود سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ مسائل کا تصفیہ ہوتا تھا اور بڑے بڑے قضیے حل کیے جاتے تھے۔ ایک انگریز مورخ (باسورتھ اسمتھ) نے لکھا ہے کہ "تاریخ میں محمدؐ کی سی ہستی بیک وقت تین فرائض انجام دیتی ہوئی نہیں مل سکتی، یعنی کہ محمدؐ ایک قوم کے بانی ہوئے۔ ایسی مثال کوئی دوسری نہیں

مل سکتی"۔ اس کے ساتھ آپؐ نے کبھی اپنے کو بادشاہ کہا جانا یا سمجھا جانا پسند نہیں کیا بلکہ اس سے انکار فرمایا۔

ایک مرتبہ ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جوں ہی آپؐ کے سامنے کھڑا ہوا رعب سے کانپنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا: "اپنے آپے میں آؤ۔ میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں۔ میں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو شوربے میں روٹی کو چورا کر کے (ثرید) کھانا کھاتی تھی۔ اسی مناسبت سے آپؐ کی عادتیں نہایت سادہ تھیں۔ تعمیر کے وقت مزدوروں کی طرح کام کرتے، بازار سے اپنا سودا خرید کر لاتے بلکہ ہمسایوں کو بھی خرید کر لادیتے تھے، عفو و کرم آپؐ کا خاصہ اور سختیوں کو ہمت کے ساتھ برداشت کرنا اور عزم و اطمینان کے ساتھ عمل کے جادہ پر قائم رہنا آپؐ کی سیرت میں نمایاں تھا۔

آپؐ کا عمل، آپؐ کی تعلیم کا مفسّر اور آپؐ کی تعلیم آپؐ کے عمل کا خلاصہ تھی۔ آپؐ کے طرز بیان کی خاص خصوصیت جامعیت تھی۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں آپؐ نے وہ اصول ودیعت کر دیئے ہیں جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کرتے ہیں۔

قرآنِ مجید

قرآن حقائق و معارف کا وہ خزانہ اور حیاتِ انسانی کا وہ مکمل دستور ہے جو آپؐ کے ذریعہ سے اہلِ عالم کی ہدایت کے لیے پیش ہوا اور کروڑ در کروڑ انسانوں نے اس وقت سے اب تک اس کی تعلیمات سے فیض حاصل کیا اور ہزاروں ایسے افراد نے بھی جو مذہبی طور سے اس پر ایمان کا اقرار نہیں رکھتے اس کی بلندی کا اعتراف کیا ہے۔

وفات

دو شنبہ کا دن دوسری ربیع الاول ۱۱ھ یا ایک قول کی بنا پر ۲۸ صفر کی وہ

قیامت خیز تاریخ تھی جب چند روز بیمار رہنے کے بعد مصلحِ عالم پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دنیا سے رحلت فرمائی۔ آپؐ کی حسب وصیت آپؐ کے بھائی اور جانشین حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ نے آپؐ کی تجہیز و تکفین فرمائی اور آپؐ کو مسجد کے پاس اسی حجرہ میں جہاں آپؐ کی وفات ہوئی تھی دفن کیا۔

مدینہ منورہ میں آپؐ کا قبۂ خضرا مسلمانانِ عالم کی زیارت گاہ ہے۔ جہاں وہ مکہ معظمہ کے حج سے پہلے یا بعد جاتے ہیں اور مسجدِ نبوی و روضۂ رسولؐ کی زیارت کا شرف حاصل کرتے ہیں۔

MAAB 1431
مرکز احیاء آثار برّ صغیر
maablib.org

حضرت امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالبؑ علیہ السلام

نام و نسب

حضرت علیؑ آلِ ابراہیمؑ میں قریش کی نسل سے بنی ہاشم کے ممتاز گھرانے میں عبد المطلبؑ کے چشم و چراغ تھے۔ صرف ایک واسطے سے آپ کا نسب حضرت پیغمبرِ خدا محمد مصطفےٰؐ سے مل جاتا ہے۔ وہ محمدؐ ابن عبد اللہ ابن عبد المطلبؑ اور یہ علیؑ ابن ابی طالبؑ ابن عبد المطلبؑ، آپ کے والد ابو طالبؑ ہی نے رسول اللہ کی پرورش بھی کی تھی اور آپ کی والدہ فاطمہؑ بنتِ اسد بھی ہاشمی ہی خاندان کی معزز خاتون تھیں جنھیں حضرت پیغمبرِ خداؐ مثل اپنی ماں کے سمجھتے تھے۔

ولادت

پیغمبرِ خداؐ کی عمر تیس برس کی تھی جب خانہ کعبہ ایسے مقدس مقام پر ۱۳ رجب ۳۰ عام الفیل میں علیؑ کی ولادت ہوئی۔ آپ کے والد ابو طالبؑ اور ماں فاطمہؑ بنت اسد کو جو خوشی ہونا چاہیے تھی وہ تو ہوئی ہی مگر سب سے زیادہ رسول اللہؐ اس بچے کو دیکھ کر خوش ہوتے۔ شاید بچےؑ کے خط و خال سے اسی وقت یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ آئندہ چل کر رسولؐ کا قوتِ بازو اور دستِ راست ثابت ہوگا۔

تربیت

حضرت علیؑ کی پرورش براہِ راست حضرت محمد مصطفےٰؐ کے ذمہ ہوئی۔ آپؐ نے انتہائی محبت اور توجہ سے اپنا پورا وقت اس چھوٹے بھائی کی علمی اور اخلاقی تربیت میں صرف کیا۔ ذاتی جوہر اور پھر رسولؐ ایسے بلند مرتبہ مربیّ کا فیضِ تربیت چنانچہ

علیؑ دس ہی برس کے سن میں ایسے تھے کہ پیغمبرؐ کے دعوائے رسالت کرنے پر ان کے سب سے پہلے پیرو بلکہ ان کے دعوے کے گواہ قرار پائے۔

بعثت

حضرت علیؑ کا دس برس کا سن تھا جب حضرت محمد مصطفےٰؐ عملی طور پر پیغام الٰہی کے پہنچانے پر مامور ہوئے اسی کو بعثت کہتے ہیں۔ زمانہ، ماحول، شہر، اپنی قوم اور خاندان سب کے خلاف ایک ایسی مہم شروع کی جا رہی تھی جس میں رسولؐ کا ساتھ دینے والا کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا بس ایک علیؑ تھے کہ جب پیغمبرؐ نے رسالت کا دعویٰ کیا تو علیؑ نے سب سے پہلے اس کی تصدیق کی اور ایمان کا اقرار کیا۔ دوسری ذات جناب خدیجۃ الکبریٰؑ کی تھی جنھوں نے خواتین کے طبقہ میں سبقتِ اسلام کے اس شرف کو حاصل کیا۔

دورِ ابتلا

پیغمبرؐ کا دعوائے رسالت کرنا تھا کہ ہر ہر ذرہ رسولؐ کا دشمن نظر آنے لگا۔ وہی لوگ جو کل تک آپؐ کی سچائی اور امانتداری کا دم بھرتے رہے تھے آج آپ کو معاذ اللہ دیوانہ، جادوگر اور نہ جانے کیا کیا کہنے لگے، راستوں میں کانٹے بچھائے جاتے، پتھر مارے جاتے اور سر پر کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا۔ اس سخت وقت میں رسولؐ کا ہر مصیبت میں شریک صرف ایک بچہ تھا۔ وہی علیؑ جس نے بھائی کا ساتھ دینے میں کبھی ہمت نہیں ہاری، برابر محبت و وفاداری کا دم بھرتے رہے۔ ہر ہر بات میں رسولؐ کے سینہ سپر رہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت بھی آیا جب مخالف گروہ نے انتہائی سختی کے ساتھ یہ طے کرلیا کہ پیغمبرؐ کا اور ان کے تمام گھرانے والوں کا بائیکاٹ کیا جائے، حالات اتنے خراب تھے کہ جانوں کے لالے پڑ گئے تھے۔ ابوطالبؑ نے تمام اپنے ساتھیوں کو حضرت محمد مصطفےٰؐ سمیت ایک پہاڑ کے دامن میں محفوظ قلعہ میں۔

بند کر دیا۔ تین برس تک یہ قید و بند کی زندگی بسر کرنا پڑی۔ اس میں ہر شب یہ اندیشہ تھا کہ کہیں دشمن شب خون نہ مارے۔ اس لیے ابو طالبؑ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ وہ رات بھر رسولؐ کو ایک بستر پر نہیں رہنے دیتے تھے بلکہ کبھی جعفرؓ کو رسولؐ کے بستر پر اور رسولؐ کو عقیلؓ کے بستر پر اور رسولؐ کو جعفرؓ کے بستر پر لٹا دیتے تھے اور رسولؐ کو علیؑ کے بستر پر۔ مطلب یہ تھا کہ اگر دشمن رسولؐ کے بستر کا پتہ لگا کر حملہ کرنا چاہے تو میرا جو بھی بیٹا چاہے قتل ہو جائے مگر رسولؐ کا بال بیکا نہ ہو۔ اس طرح علیؑ بچپنے ہی سے فداکاری اور جاں نثاری کے سبق کو عملی طور پر دہراتے رہے۔

ہجرت

اس کے بعد وہ وقت آیا کہ ابو طالبؑ کی وفات ہو گئی اور اس جان نثار چچا کی وفات سے پیغمبرؐ کا دل ٹوٹ گیا اور آپؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت کا ارادہ کر لیا جس پر دشمنوں نے ایکا کیا کہ ایک رات جمع ہو کر پیغمبرؐ کے گھر کو گھیر لیں اور حضرتؐ کو شہید کر ڈالیں۔ حضرتؐ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے اپنے اسی جان نثار بھائی علیؑ کو بلا کر اس واقعہ سے اطلاع دی اور فرمایا کہ میری جان کی رکھوالی یوں ہو سکتی ہے کہ تم آج کی رات میرے بستر پر میری چادر اوڑھ کر سو رہو اور میں مخفی طور پر مکہ سے روانہ ہو جاؤں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو یہ پیغام سنتے ہی اس کا دل دہل جاتا، مگر علیؑ نے یہ سن کر کہ میرے ذریعہ سے رسولؐ کی جان کی حفاظت ہو گی خدا کا شکر ادا کیا اور بہت خوش ہوئے کہ مجھے رسولؐ کا فدیہ قرار دیا جا رہا ہے۔ یہی ہوا کہ رسالت مآبؐ شب کے وقت مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گئے اور علیؑ بن ابی طالبؑ رسولؐ کے بستر پر سوئے۔ چاروں طرف خون کے پیاسے دشمن تلواریں کھینچے نیزے لیے ہوئے مکان کو گھیرے ہوئے تھے۔ بس اس بات کی دیر تھی کہ ذرا صبح ہو اور سب کے سب گھر میں گھس کر رسالت مآبؐ کو شہید کر ڈالیں۔ علیؑ اطمینان کے ساتھ بستر پر آرام کرتے رہے اور ذرا بھی اپنی جان کا خیال نہ کیا۔ دشمنوں کو صبح کے وقت یہ معلوم

ہوا کہ محمدؐ نہ تھے، علیؑ تھے۔ انھوں نے آپ پر یہ دباؤ ڈالنا چاہا کہ آپ بتلادیں کہ رسولؐ کہاں گئے ہیں؟ مگر علیؑ نے بڑے بہادرانہ تیوروں سے یہ بتلانے سے قطعی انکار کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ حضرت رسول اللہؐ مکہ سے کافی دور تک بغیر کسی پریشانی اور رکاوٹ کے تشریف لیجا سکے۔ علیؑ تین روز تک مکہ میں رہے۔ جن جن کی امانتیں رسول اللہؐ کے پاس تھیں ان تک ان کی امانتیں پہنچا کر خواتین بیتِ رسالت کو اپنے ساتھ لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ کئی روز تک آپ رات دن پیدل چل کر اس طرح کہ پیروں سے خون بہہ رہا تھا مدینہ میں رسولؐ کے پاس پہنچے۔ اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ علیؑ پر رسولؐ کو سب سے زیادہ اعتماد تھا جس وفاداری، ہمت اور دلیری سے علیؑ نے اس ذمہ داری کو پورا کیا ہے وہ بھی اپنی آپ مثال ہے۔

شادی

رسولؐ نے مدینے میں آکر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی اکلوتی بیٹی فاطمہ زہراؑ کا عقد علیؑ کے ساتھ کردیا۔ رسولؐ اپنی بیٹی کو انتہائی عزیز رکھتے تھے اور عزت اتنی کرتے تھے کہ جب فاطمہ زہراؑ آتی تھیں تو رسولؐ تعظیم کے لیے کھڑے ہوجاتے تھے۔ ہر شخص اس بات کا طلبگار تھا کہ رسولؐ کی اس معزز بیٹی کے ساتھ منسوب ہونے کا شرف اسے حاصل ہو۔ دو ایک نے ہمت بھی کی کہ وہ رسولؐ کو پیغام دیں مگر حضرتؐ نے سب کی خواہشوں کو رد کردیا اور یہ کہا کہ فاطمہؑ کی شادی بغیر حکمِ خدا کے نہیں ہوسکتی ہجرت کا پہلا سال تھا جب رسولؐ نے علیؑ کو اس عزت کے لیے منتخب کیا۔ یہ شادی نہایت سادگی کے ساتھ انجام دی گئی۔ شہنشاہِ دین و دنیا حضرت پیغمبرِ خدا کی بیٹی اور اس کو پیغمبرؐ کی طرف سے جہیز بھی نہیں دیا گیا۔ خود فاطمہؑ کا مہر تھا جو علیؑ سے لے کر کچھ سامانِ خانہ داری فاطمہؑ کے لیے خرید کر ساتھ کردیا گیا۔ وہ بھی کیا؟ مٹی کے کچھ برتن، خرمے کی چھال کے تکیے۔ چمڑے کا بستر اور چرخہ، چکی اور پانی بھرنے کی مشک۔ اس طرح کا سامان دیا گیا۔ علیؑ نے مہر ادا کرنے کے لیے اپنی زرہ فروخت کی اور

اس سے فاطمہ زہرا کا مہر ادا کیا گیا جو ایک سو ستّرہ تولے چاندی سے زیادہ نہ تھا۔ اس طرح مسلمانوں کے واسطے ہمیشہ کے لیے ایک مثال قائم کر دی گئی کہ وہ اپنے تقریبات کے سلسلہ میں فضول خرچی سے کام نہ لیں۔

خانہ داری

فاطمہؑ اور علیؑ کی زندگی گھریلو زندگی کا ایک بے مثال نمونہ تھی مرد اور عورت آپس میں کس طرح ایک دوسرے کے شریکِ حیات ثابت ہو سکتے ہیں۔ آپس میں کس طرح تقسیم عمل ہونا چاہیے اور کیونکر دونوں کی زندگی ایک دوسرے کے لیے مددگار ہو سکتی ہے، وہ گھر دنیا کی آرائشوں سے دور، راحت طلبی اور تن آسانی سے بالکل علیحدہ تھا۔ محنت اور مشقت کے ساتھ ساتھ دلی اطمینان اور آپس کی محبت، واعتماد کے لحاظ سے ایک جنت بنا ہوا تھا۔ جہاں سے علیؑ صبح کو مشکیزہ لے کر جاتے تھے اور یہودیوں کے باغ میں پانی دیتے تھے اور جو کچھ مزدوری ملتی تھی اسے لے کر گھر پر آتے تھے یا بازار سے جو خرید کر فاطمہؑ کو دیتے تھے اور فاطمہؑ چکی پیستی، کھانا پکاتی اور گھر میں جھاڑو دیتی تھیں۔ فرصت کے اوقات میں چرخہ چلاتی تھیں اور خود اپنے اور اپنے گھر والوں کے لباس کے لیے اور کبھی مزدوری کے طور پر سوت کاتتی تھیں اور اس طرح گھر میں رہ کر زندگی کی مہم میں اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔

maablib.org

جہاد

مدینہ میں آکر پیغمبرؐ کو مخالف گروہ نے آرام سے بیٹھنے نہ دیا۔ آپ کے وہ پیرو جو مکہ میں تھے انھیں طرح طرح کی تکلیفیں دی جانے لگیں بعض کو قتل کیا۔ بعض کو قید کیا اور بعض کو زدوکوب کیا اور تکلیفیں پہنچائیں۔ یہی نہیں بلکہ اسلحہ اور فوج جمع کر کے خود رسولؐ کے خلاف مدینہ پر چڑھائی کر دی۔ اس موقع پر رسولؐ کا اخلاقی فرض تھا کہ

وہ مدینہ والوں کے گھروں کی حفاظت کرتے جنھوں نے کہ آپ کو انتہائی ناگوار حالات میں پناہ دی تھی اور آپؐ کی نصرت و امداد کا وعدہ کیا تھا۔ آپؐ نے یہ کسی طرح پسند نہ کیا کہ آپ شہر کے اندر گھِر کر مقابلہ کریں اور دشمن کو یہ موقع دیں کہ وہ مدینہ کی پُر امن آبادی اور عورتوں اور بچوں کو بھی پریشان کر سکے۔ گو آپؐ کے ساتھ تعداد بہت کم تھی لیکن صرف تین سو تیرہ آدمی تھے ہتھیار بھی نہ تھے مگر آپؐ نے یہ طے کر لیا کہ آپ باہر نکل کر دشمن سے مقابلہ کریں گے چنانچہ پہلی لڑائی اسلام کی ہوئی۔ جو جنگِ بدر کے نام سے مشہور ہے۔ اس لڑائی میں رسولؐ نے زیادہ اپنے عزیزوں کو خطرے میں ڈالا چنانچہ آپؐ کے چچازاد بھائی عبیدہؓ ابن حارث ابن عبدالمطلب اس جنگ میں شہید ہوئے۔ علیؑ بن ابی طالبؑ کو جنگ کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ ۲۵ برس کی عمر تھی مگر جنگ کی فتح کا سہرا علیؑ کے سر رہا۔ جتنے مشرکین قتل ہوئے تھے ان میں سے آدھے صرف علیؑ کے ہاتھ کے مقتول تھے اور آدھے تمام مجاہدین کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے اس کے بعد اُحد، خندق، خیبر اور آخر میں حنین یہ وہ بڑی لڑائیاں ہیں جن میں علیؑ نے رسولؐ کے ساتھ رہ کر اپنی بے نظیر بہادری کے جوہر دکھلائے۔ تقریباً ان تمام لڑائیوں میں علیؑ کو علمداری کا عہدہ بھی حاصل رہا۔ اس کے علاوہ بہت سی لڑائیاں ایسی تھیں جن میں رسولؐ نے علیؑ کو تنہا بھیجا اور انھوں نے اکیلے فتح بھی حاصل کی۔ ان تمام لڑائیوں میں حضرت علیؑ نے بڑی بہادری اور ثابت قدمی دکھائی اور انتہائی استقلال، تحمّل اور شرافتِ نفس سے کام لیا جس کا اقرار خود ان کے دشمن بھی کرتے تھے۔ خندق کی لڑائی میں دشمن کے سب سے بڑے سورما عمرو بن عبدود کو جب آپ نے مغلوب کر لیا اور اس کا سر کاٹنے کے لیے اس کے سینے پر بیٹھے تو اس نے آپؑ کے چہرے پر لعاب دہن پھینک دیا۔ آپ کو غصہ آگیا اور آپ اس کے سینے پر سے اتر آئے۔ صرف اس خیال سے کہ اگر غصے میں اس کو قتل کیا تو یہ عمل محض خدا کی راہ میں نہ ہوگا بلکہ اپنی خواہش نفس کے مطابق ہوگا کچھ دیر کے بعد آپ نے اس کو قتل کیا۔ اس زمانے میں دشمن کو ذلیل کرنے کے لیے اس کی لاش کو برہنہ کر دیتے تھے مگر حضرت علیؑ نے اس کی زرہ نہیں اُتاری اگرچہ

وہ بہت قیمتی تھی۔ چنانچہ اس کی بہن جب اپنے بھائی کی لاش پر آئی تو اس نے کہا کہ کسی اور نے میرے بھائی کو قتل کیا ہوتا تو میں عمر بھر روتی مگر مجھے یہ دیکھ کر صبر آگیا کہ اس کا قاتل علیؑ کا سا شریف انسان ہے جس نے اپنے دشمن کی لاش کی توہین گوارا نہیں کی، آپ نے کبھی دشمن کی عورتوں یا بچوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا اور کبھی مالِ غنیمت کی طرف رخ نہیں کیا۔

خدمات

علاوہ جہاد کے اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ کے لیے کسی کام کے کرنے میں آپ کو انکار نہ تھا۔ یہ کام مختلف طرح کے تھے رسولؐ کی طرف سے عہد ناموں کا لکھنا، خطوط تحریر کرنا آپ کے ذمہ تھا اور لکھے ہوئے اجزائے قرآن کے امانتدار بھی آپ تھے۔ اس کے علاوہ یمن کی جانب تبلیغِ اسلام کے لیے پیغمبرؐ نے آپ کو روانہ کیا جس میں آپ کی کامیاب تبلیغ کا اثر یہ تھا کہ سارا یمن مسلمان ہو گیا۔ جب سورۂ برأت نازل ہوا تو اس کی تبلیغ کے لیے بحکم خدا آپ ہی مقرر ہوئے اور آپ نے جا کر مشرکین کو سورۂ برأت کی آیتیں سنائیں۔ اس کے علاوہ رسالت مآبؐ کی ہر خدمت انجام دینے پر تیار رہتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ بھی دیکھا گیا کہ رسولؐ کی جوتیاں اپنے ہاتھ سے سی رہے ہیں۔ علیؑ اسے اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔

اعزاز

حضرت علیؑ کے امتیازی صفات اور خدمات کی بنا پر رسولؐ ان کی بہت عزت کرتے تھے اور اپنے قول اور فعل سے ان کی خوبیوں کو ظاہر کرتے رہتے تھے۔ کبھی یہ کہتے تھے کہ "علیؑ مجھ سے ہیں اور میں علیؑ سے ہوں"۔ کبھی یہ کہا کہ "میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے"۔ کبھی یہ کہا کہ "تم سب میں بہترین فیصلہ کرنے والا علیؑ ہے"۔ کبھی یہ کہ "علیؑ کو مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی"۔ کبھی یہ کہ "علیؑ مجھ سے وہ تعلق رکھتے ہیں جو روح کو جسم سے یا سر کو بدن سے ہوتا ہے"۔

maablib.org

کبھی یہ کہ "وہ خدا و رسولؐ کے سب سے زیادہ محبوب ہیں" یہاں تک کہ مباہلہ کے واقعہ میں علیؑ کو نفسِ رسولؐ کا خطاب ملا۔ عملی اعزاز یہ تھا کہ مسجد میں سب کے دروازے بند ہوئے تو علیؑ کا دروازہ کھلا رکھا گیا۔ جب مہاجرین و انصار میں بھائی چارہ کیا گیا تو علیؑ کو پیغمبرؐ نے اپنا دنیا و آخرت کا بھائی قرار دیا اور سب سے آخر میں غدیر خم کے میدان میں ہزاروں مسلمانوں کے مجمع میں علیؑ کو اپنے ہاتھوں پر بلند کر کے یہ اعلان فرمایا کہ "جس طرح میں مسلمانوں کا سرپرست اور حاکم ہوں اسی طرح علیؑ سب کے سرپرست اور حاکم ہیں۔" یہ اتنا بڑا اعزاز تھا کہ تمام مسلمانوں نے علیؑ کو مبارکبادیں دیں اور سب نے سمجھ لیا کہ پیغمبرؐ نے علیؑ کی ولی عہدی اور جانشینی کا اعلان کر دیا ہے۔

رسولؐ کی وفات

ہجرت کو دس برس پورے ہوتے تھے جب پیغمبرِ خدا اس بیماری میں مبتلا ہوئے جو مرض الموت ثابت ہوئی۔ یہ خاندانِ رسولؐ کے لیے ایک قیامت خیز مصیبت کا وقت تھا۔ علیؑ رسولؐ کی بیماری میں برابر پاس موجود رہتے اور تیمارداری میں مصروف رہتے تھے اور رسولؐ بھی علیؑ کا اپنے پاس سے ہٹنا ایک لمحہ کے لیے گوارا نہ کرتے تھے۔ آپ نے علیؑ کو اپنے پاس بلایا اور سینے سے لگا کر بہت دیر تک آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے اور ضروری وصیتیں فرمائیں۔ اس گفتگو کے بعد بھی علیؑ کو اپنے سے جدا نہ ہونے دیا اور ان کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا۔ جس وقت رسولؐ کی روح جسم سے جدا ہوئی ہے اس وقت بھی علیؑ کا ہاتھ رسولؐ کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔

بعدِ رسولؐ

جس نے زندگی بھر پیغمبرؐ کا ساتھ دیا وہ بعد رسولؐ آپ کی لاش کو کس طرح چھوڑتا، چنانچہ رسولؐ کی تجہیز و تکفین اور غسل و کفن کا تمام کام علیؑ ہی کے ہاتھوں ہوا اور قبر میں

آپ ہی نے رسولؐ کو تا رامر سولؐ کے دفن سے فرصت ہونے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اتنی دیر میں پیغمبرؐ کی جانشینی کا انتظام ہو گیا ہے۔ اگر کوئی دوسرا انسان ہوتا تو جنگ آزمائی پر تیار ہو جاتا مگر علیؑ کو اسلامی مفاد اتنا عزیز تھا کہ آپ نے اپنے حقوق کے اعلان کے باوجود اپنی طرف سے مسلمانوں میں خانہ جنگی پیدا نہیں ہونے دی، نہ صرف یہ کہ آپ نے معرکہ آرائی نہیں چاہی بلکہ جس وقت ضرورت پڑی، اس وقت اسلامی مفاد کی خاطر آپ نے امداد دینے سے دریغ بھی نہیں کی۔ مشکل مسائل کے فیصلہ اور ضروری مشورہ لیے جانے پر اپنی مفید رائے کے اظہار سے کبھی پہلو نہیں بچایا۔ اس کے علاوہ بہ طور خود خاموشی کے ساتھ اسلام کی روحانی اور علمی خدمت میں مصروف رہے۔ قرآن کو ترتیبِ نزول کے مطابق ناسخ و منسوخ اور محکم اور متشابہ کی تشریح کے ساتھ مرتب کیا۔ مسلمانوں کے علمی طبقے میں تصنیف و تالیف کا اور علمی تحقیق کا ذوق پیدا کیا اور خود بھی تفسیر اور کلام اور فقہ و احکام کے بارے میں ایک مفید علمی ذخیرہ فراہم کیا بہت سے ایسے شاگرد تیار کیے جو مسلمانوں کی آئندہ علمی زندگی کیلئے معمار کا کام انجام دے سکیں، زبان عربی کی حفاظت کیلئے علم نحو کی داغ بیل ڈالی اور فن صرف اور معانی بیان کے اصول کو بھی بیان کیا اس طرح یہ سبق دیا کہ اگر ہوائے زمانہ مخالف بھی ہو اور اقتدار نہ بھی تسلیم کیا جائے تو انسان کو گوشہ نشینی اور بے سرو سامانی میں بھی اپنے فرائض کو فراموش نہ کرنا چاہیئے۔ ذاتی اعزاز اور منصب کی خاطر مفاد ملی کو نقصان نہ پہنچایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو انسان اپنی ملت، قوم اور مذہب کی خدمت ہر حال میں کرتا رہے۔

maablib.org

خلافت

پچیس برس تک رسولؐ کے بعد علیؑ نے خانہ نشینی میں بسر کی، ۳۵ھ میں مسلمانوں نے خلافتِ اسلامی کا منصب علیؑ کے سامنے پیش کیا۔ آپ نے پہلے انکار کیا، لیکن جب مسلمانوں کا اصرار بہت بڑھ گیا تو آپ نے اس شرط سے منظور کیا کہ میں بالکل قرآن اور سنتِ پیغمبرؐ کے مطابق حکومت کروں گا اور کسی رورعایت سے کام

نہ لوں گا۔ مسلمانوں نے اس شرط کو منظور کیا اور آپ نے خلافت کی ذمہ داری قبول کی مگر زمانہ آپ کی خالص مذہبی سلطنت کو برداشت نہ کر سکا، آپ کے خلاف بنی امیہ اور بہت سے وہ لوگ کھڑے ہو گئے جنھیں آپ کی مذہبی حکومت میں اپنے اقتدار کے زائل ہونے کا خطرہ تھا، آپ نے ان سب سے مقابلہ کرنا اپنا فرض سمجھا اور جملؔ اور صفینؔ اور نہروانؔ کی خون ریز لڑائیاں ہوئیں۔ جن میں علیؑ بن ابی طالبؑ نے اسی شجاعت اور بہادری سے جنگ کی جو بدرؔ و اُحدؔ، خندقؔ و خیبرؔ میں کسی وقت دیکھی جا چکی تھی اور زمانہ کو یاد تھی۔ ان لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے آپ کو موقع نہ مل سکا کہ آپ کا جیسا دل چاہتا تھا اس طرح اصلاح فرمائیں۔ پھر بھی آپ نے اس مختصر مدّت میں اسلام کی سادہ زندگی، مساوات اور نیک کمائی کے لیے محنت و مزدوری کی تعلیم کے نقش تازہ کر دیئے۔ آپ شہنشاہِ اسلام ہونے کے باوجود کھجوروں کی دکان پر بیٹھنا اور اپنے ہاتھ سے کھجوریں بیچنا بُرا نہیں سمجھتے تھے، پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے تھے، غریبوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھا لیتے تھے۔ جو روپیہ بیت المال میں آتا تھا اسے تمام مستحقین پر برابر سے تقسیم کرتے تھے، یہاں تک کہ آپ کے سگے بھائی عقیلؓ نے یہ چاہا کہ کچھ انہیں دوسرے مسلمانوں سے زیادہ مل جائے مگر آپ نے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر میرا ذاتی مال ہوتا تو خیر یہ بھی ہو سکتا تھا مگر یہ تمام مسلمانوں کا مال ہے۔ مجھے حق نہیں ہے کہ میں اس میں سے کسی اپنے عزیز کو دوسروں سے زیادہ دوں، انتہا ہے کہ اگر کبھی بیت المال میں شب کے وقت حساب و کتاب میں مصروف ہوئے اور کوئی ملاقات کے لیے آ کر غیر متعلق باتیں کرنے لگا تو آپ نے چراغ بڑھا دیا کہ بیت المال کے چراغ کو میرے ذاتی کام میں صرف نہ ہونا چاہیئے۔ آپ کی کوشش یہ رہتی تھی کہ جو کچھ بیت المال میں آئے وہ جلد سے جلد حق داروں تک پہنچ جائے۔ آپ اسلامی خزانے میں مال کا جمع رکھنا پسند نہیں فرماتے تھے

شہادت

افسوس ہے کہ یہ امن، مساوات اور اسلامی تمدّن کا علمبردار دنیا طلب لوگوں کی

عداوت سے نہ بچا اور ۱۹ ماہ رمضان ۴۰ ھ کو صبح کے وقت خدا کے گھر یعنی مسجد میں عین حالت نماز میں ایک زہر میں بجھی ہوئی تلوار سے زخمی کیا گیا۔ آپ کے رحم وکرم اور مساوات پسندی کی انتہا یہ تھی کہ جب آپ کے قاتل کو گرفتار کر کے آپ کے سامنے لائے اور آپ نے دیکھا کہ اس کا چہرہ زرد ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں تو آپ کو اس پر بھی رحم آگیا اور اپنے دونوں فرزندوں امام حسنؑ و امام حسینؑ کو ہدایت فرمائی کہ یہ تمھارا قیدی ہے اس کے ساتھ کوئی سختی نہ کرنا جو کچھ خود کھانا وہ اسے کھلانا۔ اگر میں اچھا ہوگیا تو مجھے اختیار رہے میں چاہوں گا تو سزا دوں گا اور چاہوں گا تو معاف کر دوں گا اور اگر میں دنیا میں نہ رہا اور تم نے اس سے انتقام لینا چاہا تو اسے ایک ہی ضربت لگانا کیونکہ اس نے مجھے ایک ہی ضربت لگائی ہے اور ہرگز اس کے ہاتھ پاؤں وغیرہ قطع نہ کیے جائیں، اس لیے کہ یہ تعلیمِ اسلام کے خلاف ہے۔ دو روز تک علیؑ بستر بیماری پر انتہائی کرب اور تکلیف کے ساتھ رہے آخر کار زہر کا اثر جسم میں پھیل گیا اور ۲۱ ماہ رمضان کو نمازِ صبح کے وقت آپ کی وفات ہوئی۔ حسنؑ و حسینؑ نے تجہیز و تکفین کی اور پشتِ کوفہ پر نجف کی سرزمین میں وہ انسانیت کا تاجدار ہمیشہ کے لیے آرام کی نیند سونے کے واسطے دفن ہوگیا۔

مرکز احیاء آثار برصغیر
maablib.org

MAAB 1431
maablib.org

حضرت سیّدۃ النساء فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا

نام و نسب

نام فاطمہؑ مشہور ترین لقب زہراؑ اور کنیت ام ابیہا تھی۔ آپ حضرت خدیجہؑ بنتِ خویلد کے بطن سے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فردِ فرید بیٹی تھیں جن کی نسلِ پاک سے باپ کے نام اور کام کی بقا رہی اور شاید اسی مناسبت سے آپ کی وہ کنیت ہوئی جس کے معنی ہوتے ہیں اپنے باپ کی ماں یعنی وہ خاتون جو اپنے باپ کی زندگی کو پروان چڑھانے کا سبب ہوتی۔

ولادت

یوں تو فرقہ وارانہ اختلافات کے ساتھ بہت سی تاریخی حقیقتیں ایسی ہیں جو مرکزِ اختلاف بن گئی ہیں خصوصاً ولادت اور وفات کی تاریخوں کے بارے میں تو خود ایک فرقہ کی روایات میں بھی اکثر اختلاف ہوتا ہے مگر عموماً یہ اختلاف چند مہینوں یا دو ایک برس سے آگے نہیں بڑھتا لیکن سیدۂ عالمؑ کی تاریخ ولادت کے بارے میں فرقِ اسلامیہ میں جو اختلاف ہے وہ ذرا سے ہیر پھیر کے نتیجہ میں نو دس برس کی طولانی مدت کا فرق پیدا کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ مورخین اہل سنت کی اکثریت کا قول یہ ہے کہ آپ کی ولادت بعثت سے پانچ برس پہلے ہوئی تھی اور فرقہ شیعہ کے روایات یہ ہیں کہ آپ بعثت سے پانچ برس بعد پیدا ہوئی تھیں۔ ان روایات کی بنیاد اہل بیت معصومینؑ کے ارشادات پر ہے۔ مذہبی طور پر ان روایات کے مستند ہونے کے علاوہ غالباً ہر غیر جانبدار محقق تاریخی نقطہ نگاہ سے بھی اس سے اتفاق کرے گا کہ کسی شخصیت اور بالخصوص پردہ نشین خاتون کے متعلق اس کے گھرانے والوں بلکہ اولاد کا بیان جتنا معتبر ہو سکتا ہے

اتنا کسی غیر کا بیان معتبر نہیں ہو سکتا۔ ان بیانات کی بنا پر صحیح قول یہی قرار پاتا ہے کہ حضرت سیدۂ عالم ۲۰ جمادی الثانی کو بعثت کے پانچویں سال یعنی ہجرت کے آٹھ برس قبل پیدا ہوئیں۔

تربیت

رسولؐ کی بعثت کے دسویں برس خدیجہ کبریٰؑ نے دنیا سے مفارقت کی۔ اس وقت سیدۂ عالمؑ صرف پانچ سال کی تھیں۔ اتنی مختصر عمر میں ماں کی آغوشِ شفقت سے جدائی کے بعد آپ کا گہوارۂ تربیت صرف باپ کا سایہ رحمت تھا اور پیغمبر اسلامؐ کی اخلاقی تربیت کا آفتاب تھا جس کی شعاعیں براہِ راست اس بے نظیر گوہر کی آب و تاب میں اضافہ کر رہی تھیں۔ عورتوں میں اگر کسی کی صحبت اس عمر میں جناب سیدہؑ کو حاصل ہو سکتی تھی تو وہ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی والدہ فاطمہؑ بنتِ اسد ہو سکتی ہیں یا آپ کی بہنیں ام ہانی وغیرہ یا پھوپھی صفیہ بنت عبد المطلب۔ یہ تمام بزرگ خواتین تھیں جو سیدۂ عالمؑ کی شمعِ عصمت کا پروانہ بنی رہتی ہوں گی اور اسی ماحول میں سیدہؑ کا بچپنا اپنی منزلیں طے کر رہا تھا۔

غم خواری

سیدہؑ کا بچپن اپنے والد بزرگوار کو اس ناگوار ماحول میں دیکھتے گزرا جو پیامِ توحید پہنچانے اور پھر حضرت ابو طالبؑ اور جناب خدیجہؑ کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد درپیش تھا۔ سیدہؑ اکثر اپنے باپ کے سر مبارک پر اشاعتِ حق کے جرم میں کوڑا کرکٹ پھینکا جانا سنتیں اور ان کے جسم کو پتھروں سے لہولہان دیکھتی تھیں اور ان منصوبوں کا چرچا ان کے کانوں تک پہنچتا تھا جو ان کے والدؐ بزرگوار کے مشن بلکہ ان کی زندگی کو بھی ختم کرنے کے لیے قائم کیے جاتے تھے مگر اس کم سنی کے عالم میں بھی سیدۂ عالمؑ نہ ڈریں نہ سہمیں نہ گھبرائیں بلکہ اس ننھی سی عمر میں اپنے بزرگ مرتبہ باپ کی مددگار رہیں۔

ہجرت

سیّدۂ عالمؑ کی عمر آٹھ برس کی تھی جب کافروں نے ایکا کر کے ایک شب رسولؐ کو قتل کرنے کا ارادہ کر کے آپؐ کے گھر کو گھیر لیا۔ آپؐ کو قدرت کی طرف سے اس کی اطلاع پہلے ہو گئی تھی اس لیے آپؐ اپنے چچازاد بھائی حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دے کر خود مخفی طریقہ پر مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ حضرت علیؑ بستر رسولؐ پر تھے اور مکان کے اندر حضرت علی بن ابی طالبؑ کی والدہ فاطمہ بنت اسدؑ کے ساتھ سیدۂ عالم فاطمہ زہرا بھی تھیں۔ اس وقت آپ کی عمر آٹھ برس تھی اور یقیناً آپ کی زندگی کا بڑا امتحان تھا اپنے گھر کے گرد خون کے پیاسے دشمنوں اور ان کی کھینچی ہوئی تلواروں کا گھیرا تھا جس سے گھر میں رہ جانے والے سب ہی افراد پر ظاہری اسباب کے لحاظ سے دہشت پیدا ہونا چاہیئے۔ اور اُدھر باپ کی جدائی کا صدمہ اور ان کی جان کی حفاظت کا خیال، مگر سیدۂ نے اسی کم سنی میں اس مرحلہ کو صبر و استقلال سے طے کیا۔ پھر صبح کو جب دشمنوں نے دیکھا کہ رسولؐ چلے گئے ہیں اور ان کی جگہ پر علیؑ ہیں تو وہ سب گھر بار کو چھوڑ کر رسولؐ کی تلاش میں چلے گئے۔ اس وقت مکان کے رہنے والوں سے وقتی طور پر خطرہ دور ہو گیا مگر رسولؐ کے متعلق ان کی فکر بڑھ گئی ہو گی۔ پھر چند روز کے بعد علیؑ بن ابی طالبؑ کا تن تنہا ان خواتین کو محملوں پر سوار کر کے اپنے ساتھ لینا اور مکّہ سے نکل کر مدینہ کی طرف روانہ ہونا اور راستے میں مشرکین کا آگر سدِ راہ ہونا اور علیؑ کا تلوار کھینچنا، یہ سب عورتوں اور بچوں کے لیے کچھ کم دہشتناک حالات نہ تھے جن سے گزر کر سیدۂ عالمؑ اپنے والد بزرگوارؐ کے پاس مدینہ منورہ پہنچ گئیں۔

شادی

مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد ایک سال کے اندر فاطمہؑ زہرا کی عمر نو برس کی ہو گئی۔ شریعتِ اسلام میں یہ سن لڑکی کے بلوغ کا قرار دیا گیا ہے اور تاکید ہے کہ اس کے بعد شادی

میں دیر نہ کی جائے۔

اصحابِ رسولؐ میں بہت سے افراد رسولؐ کی صرف دامادی کی نسبت حاصل کرنے کے شرف کی تمنا رکھتے تھے۔ مگر اس کے پہلے صاحبزادی کی کم سنی کا عذر اس سوال میں رکاوٹ پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔ اب جب کہ ابتدائی عمر شادی کی آگئی تو مجسم خُلقِ عظیم رسولؐ کی بارگاہ میں ہر ایک عرضِ تمنّا کے لیے آنے لگا مگر رسولؐ کی طرف سے کوئی ہمت افزا جواب نہ ملا۔ خدا اور رسولؐ کے نزدیک فاطمہ زہراؑ کے ساتھ شادی کے لیے صرف ایک فرد موزوں تھا جو اب تک خاموش تھا۔ یہ علیؑ کی ذات تھی جنھوں نے رسولؐ کی گود میں بچپن سے پرورش پائی تھی اور جس طرح فاطمہؑ اپنے طبقہ میں آپؐ کی اخلاقی تعلیم کا بہترین مرقع تھیں اسی طرح علیؑ مردوں میں آپؐ کے تعلیمات کا مجسمہ تھے۔ علیؑ کے لیے فاطمہؑ اور فاطمہؑ کے لیے علیؑ کے سوا برابر کا کوئی دوسرا ہو ہی نہ سکتا تھا، مگر علیؑ رسولؐ سے خواستگاری کرتے ہوئے حجاب محسوس کرتے تھے اور رسولؐ کو خود سے اس بارے میں کسی ارشاد کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ جب ہر ایک اظہارِ تمنّا کرنے والے کی خواہش ٹھکرا دی گئی تو انہی میں سے کچھ نے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ سے تحریک کی کہ آپ بھی رسولؐ کی خدمت میں جا کر فاطمہؑ کی خواستگاری کریں۔ آخر علیؑ رسولؐ کی بارگاہ میں آئے۔ جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ عرضِ تمنّا کی۔ رسولؐ نے بشاش چہرہ کے ساتھ فرمایا کہ تمھارے پاس مالِ دنیا سے کچھ ہے؟ عرض کیا "بس گھوڑا، تلوار اور زرہ"۔ فرمایا "گھوڑا اور تلوار تمھارے ایسے مجاہد کے لیے ضروری ہے مگر زرہ زائد ہے۔ اس کو فروخت کر ڈالو"۔ عام مورخین کی روایت کے مطابق یہ زرہ ۴۸۰ درہم کو فروخت ہوئی۔ اس رقم کو آپ نے بطور مہر سیّدۂ عالم رسولؐ کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ اسی سے رسولؐ نے فاطمہؑ کی شادی کا سامان کیا اور بیٹی کے لیے نظامِ خانہ داری میں جس اسباب کی ضرورت تھی وہ خرید فرمایا۔ وہ کیا تھا؟ ایک چمڑے کا تکیہ کھجور کی چھال سے بھرا ہوا۔ ایک بچھونا کھال کا اور کچھ مٹی کے برتن، ایک چکی اور ایک چرخہ۔ ان مورخین کا بیان ہے کہ وہ مہر فاطمہ زہراؑ کا جو حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے ادا کیا اور جس پر حضرت فاطمہ زہراؑ کا نکاح پڑھا گیا چار سو

مثقال چاندی تھا۔ تقریباً یہی مقدار پانچ سو درہم "مہر سنت" قرار پائی ہے جس کی مقدار ایک سو سترہ تولہ چاندی ہوتی ہے مگر مہر سنت کا مطلب یہ ہے کہ اس سے زیادہ ہونا فضیلت کے خلاف ہے۔ اتنا ہی ہو اور یا اس سے کم ہو اور اسی لیے فرقۂ شیعہ کے معتبر ترین جوامع حدیث یعنی کتب اربعہ کے بعض احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا مہر ظاہری طور پر اس عام مہر سے بھی جو مہر سنت قرار دیا گیا ہے بہت کم یعنی صرف تیس درہم قرار دیا گیا تھا۔ اگرچہ خالق کی طرف سے حضرت سیدۂ عالمؑ کی روحانی عظمت کے لحاظ سے مہر سیدہؑ میں خدا کی خدائی کا بہت بڑا حصہ تھا مگر سیدہؑ کے مہر کو ظاہری حیثیت سے بہت کم رکھ کر ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کی اس ذہنیت کو تبدیل کرنے کا سامان کیا گیا کہ وہ مہر کی رقم کے خواہ مخواہ زیادہ ہونے کو معیارِ عزت نہ سمجھ لیں بلکہ یہ سمجھیں کہ مہر کا کم ہونا سیدہ عالمؑ کی پیروی ہونے کے لحاظ سے بہت بڑی عزت کا سرمایہ ہے۔ آخر کو اسلامی تاریخ میں ایک مثالی تقریب کے طور پر یہ شادی عمل میں آئی اور اگر مسلمان اس شادی کی کیفیت کو پیشِ نظر رکھیں تو کبھی بے جا رسوم سے اپنی بربادی کی صورتیں اختیار کرنے میں عزت محسوس نہ کریں۔

اولاد

شادی ہونے کے بعد حضرت فاطمہؑ زہرا صرف نو برس زندہ رہیں اس نو برس میں آپ کے یہاں شادی کے دوسرے ہی سال حضرت امام حسنؑ پیدا ہوئے۔ تیسرے سال حضرت امام حسینؑ۔ پھر غالباً پانچویں سال حضرت زینبؑ اور ساتویں سال حضرت ام کلثومؑ، نویں سال محسنؑ بطن میں تھے جب کہ وفاتِ رسولؐ ہوئی اور وہ ناگوار مصائب پیش آئے جن کے سبب سے اسقاط ہو گیا اور حضرت سیدہؑ بھی جانبر نہ ہو سکیں۔ وفات کے وقت دو صاحبزادے حسنؑ اور حسینؑ موجود تھے جو امامِ خلق ہوئے اور دو صاحبزادیاں زینبؑ و امِ کلثومؑ تھیں جو اپنے اوصاف کے لحاظ سے طبقۂ خواتین میں اپنی ماں کی سچی جانشین ثابت ہوئیں۔

اخلاق واوصاف

سیدۂ عالمؑ شکل و شمائل، گفتار و رفتار اور حسنِ بیان ہر بات میں رسولؐ سے انتہائی مشابہ اور خصوصیت کے ساتھ سچائی اور امانتداری میں اپنے والد بزرگوار کی مکمل تصویر تھیں۔ آپ نے اپنی مختصر زندگی میں نسوانی زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی بلند سیرت کے وہ نمایاں نقوش چھوڑے ہیں جو ہمیشہ ہمیشہ اس طبقہ کی راہنمائی کے لیے کافی ہیں۔

خانہ داری

فاطمہ زہراؑ نے شادی کے بعد سے تمام گھر کا کام اپنے ہاتھ سے کرنا شروع کیا، جھاڑو دینا، کھانا پکانا، چرخہ چلانا، چکی پیسنا اور بچوں کی تربیت کرنا، یہ سب کام اور ایک اکیلی سیدۂؑ لیکن نہ تو کبھی تیوریوں پر بل آئے نہ اپنے شوہر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ سے کبھی اپنے لیے کسی مددگار یا خادمہ کے انتظام کی فرمائش کی۔ ایک مرتبہ اپنے پدر بزرگوار حضرت رسولِ خداؐ سے ایک کنیز عطا کرنے کی خواہش کی تو رسولؐ نے بجائے کنیز عطا کرنے کے وہ تسبیح تعلیم فرمائی جو تسبیحِ فاطمہ زہراؑ کے نام سے مشہور ہے۔ ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ حضرت فاطمہؑ اس تسبیح کی تعلیم سے اتنی خوش ہوئیں کہ کنیز کی خواہش ترک کر دی۔ بعد میں رسولؐ نے بلا طلب ایک کنیز عطا فرمائی جو فضہؓ کے نام سے مشہور ہے۔ سیدۂؑ فضہؓ کے ساتھ ایک کنیز کا سا نہیں بلکہ برابر سے ایک رفیق کا سا برتاؤ کرتی تھیں۔ اسلام کی تعلیم یقیناً یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں زندگی کے جہاد میں مشترک طور پر حصہ لیں اور کام کریں۔ بیکار نہ بیٹھیں مگر ان دونوں میں صنف کے اختلاف کے لحاظ سے تقسیم عمل ہے۔ اس تقسیم کار کو علیؑ اور فاطمہؑ نے مکمل طریقہ پر دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ گھر سے باہر کے تمام کام، آب کشی کرنا، باغوں میں پانی دینا اور اپنی قوتِ بازو سے اپنے اور اپنے گھر والوں کی بسر زندگی کا سامان کرنا یہ علیؑ کے ذمہ تھے اور گھر کے اندر کے تمام کام حضرت فاطمہ زہراؑ انجام دیتی تھیں۔ یہ ضروری نہیں کہ

آج چودہ سو برس کے بعد بھی کاموں کی شکل وہی رہے جو پہلے تھی بلکہ زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے ان میں فرق ہو سکتا ہے مگر اس روح کو جو گھر کے اندر اور باہر کی زندگی کے تفرقہ کے ساتھ قائم ہے، محفوظ رکھا جانا ہر حال میں ضروری ہے۔

تزک و احتشام اور آرائش سے علیحدگی

عام طور سے خواتین کی طبیعت اسبابِ زیب و زینت کی طرف خاص رغبت رکھتی ہے۔ اس کے سبب سے اکثر مردوں کو پریشانی اٹھانا پڑتی ہے اور بسا اوقات آمد و خرچ کے توازن میں فرق کی ذمہ دار یہی آرائش پسندی ہوتی ہے جس سے اقتصادی تباہی آتی ہے۔ سیدۂ عالمؑ نے ہمیشہ اپنی زندگی کو مسلمانوں کے غریب گھرانوں کی عورتوں کے لیے بہترین نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا اور کبھی لباس وغیرہ یا سامانِ خانہ داری میں تصنع اور تجمل کو پسند نہیں کیا اور خود رسولؐ کی تعلیم بھی یہی رہی بلکہ بعض روایتوں میں ہے کہ ایک مرتبہ سیدۂ عالمؑ نے اپنے لیے دو چاندی کے کنگن، گلو بند اور دو گوشوارے اور دروازہ کا نیا پردہ تیار کرا لیا تھا اور پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو آپؐ کی صرف ایک معنی خیز خاموشی سے سیدہؑ کو بہتر یہ معلوم ہوا کہ اسے راہِ خدا میں خیرات کر دیں۔ رسالت مآبؐ کو یہ معلوم ہوا تو اتنا خوش ہوئے کہ تین مرتبہ فرمایا "وہی کیا جو میں چاہتا تھا اس کا باپ اس پر فدا ہو جائے۔" اس معلمِ انسانیتؐ عظیم ترین باپ کی یہ بلند مرتبہ بیٹی ہی صرف وہ تھی جو اس کے بلند اخلاقی معیارِ تعلیم کو عمل کی مجسم شکل میں اس نقطہ پر لا سکے جو اس کا معراجِ بلندی ہے۔

عبادت و دعا کے موقع پر ایثار

(فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی عبادت وہ تھی جو عالمِ انسانیت کے اس طبقہ کے لیے جاودانی مثال ہے۔ عبادت بظاہر مخلوق اور خالق کے درمیان کی انفرادی چیز ہے اس لیے زیادہ تر عبادت کرنے والے ایسے ہوں گے جو شاید اپنے مال بلکہ غذا میں بھی دوسروں

کو اپنے اوپر مقدم کر سکتے ہوں مگر اللہ کی بارگاہ میں تو "خود غرضی" ہی نظر آتی ہے لیکن آلِ رسولؐ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ وہ خالق کی بارگاہ میں بھی کھڑے ہوتے تھے تو دوسرے مخلوق کا درد اپنے دل میں لیے ہوئے چنانچہ حضرت سیدہ عالمؑ کے متعلق شاہزادہ امام حسنؑ کا بیان ہے کہ سیدہ عالمؑ نے رات بھر محرابِ عبادت میں کھڑے ہو کر نماز پڑھی اور مومنین و مومنات کے لیے بہت دعا کی مگر اپنے لیے کوئی دعا نہ مانگی۔ اس کے بعد میں شاہزادہؑ نے آپ سے ذکر کیا تو فرمایا کہ الجار ثم الدار یہ عربی کی کہاوت ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ پڑوسی کا خیال گھر کی دیکھ بھال سے مقدم ہے۔

پردہ

سیدہؑ عالم نہ صرف اپنی سیرت زندگی بلکہ اقوال سے بھی خواتین کے لیے پردہ کی اہمیت پر بہت زور دیتی تھیں۔ آپ کا مکان مسجدِ رسولؐ سے بالکل متصل تھا لیکن آپ برقع و چادر میں نہاں ہو کر بھی اپنے والدِ بزرگوار کے پیچھے نماز جماعت میں شرکت یا آپ کے موعظہ کے سننے کے لیے مسجد میں تشریف نہیں لائیں بلکہ اپنے فرزند امام حسنؑ سے جب وہ مسجد سے واپس جاتے تھے اکثر رسولؐ کے خطبہ کے مضامین سن لیا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ پیغمبرؐ نے منبر پر یہ سوال پیش کر دیا کہ عورت کے لیے سب سے بہتر کیا چیز ہے؟ یہ بات سیدہؑ تک پہنچی تو آپ نے جواب دیا کہ عورت کے لیے سب سے بہتر بات یہ ہے کہ نہ اس کی نظر کسی غیر مرد پر پڑے اور نہ کسی غیر مرد کی نظر اس پر پڑے۔ رسولؐ کے سامنے یہ جواب پیش ہوا تو حضرتؐ نے فرمایا، "کیوں نہ ہو، فاطمہؑ میرا ہی ایک جزو ہے۔"

خدمتِ اسلام

اسلامی تعلیم میں عورت کے جہاد کی نوعیت ہی مرد کے جہاد سے الگ رکھی گئی ہے لہٰذا حضرت فاطمہ زہراؑ بھی اس کی پابند تھیں اس لیے کسی جہاد میں سیدہ عالمؑ کا

میدانِ جنگ میں قدم رکھنا ثابت نہیں ہوتا لیکن جس حد تک ان کے حدودِ عمل تھے ان میں ان جہادوں کے ذیل میں بھی غیر متعلق نہ تھیں۔ مثلاً جنگِ اُحد میں جب پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مدینہ واپس آئے[1] اس حالت میں کہ چہرہ خون سے رنگین تھا تو سیدۂ عالم ہی تھیں جو ظرف میں پانی لے کر حاضر ہوئیں اور رسولؐ کا چہرہ دُھلوایا۔ علیؑ بن ابی طالبؑ آئے۔ اس شان سے کہ شانوں تک دونوں ہاتھ دشمنوں کے خون سے رنگین تھے اور تلوار سے خون ٹپک رہا تھا۔ آپ نے تلوار فاطمہ زہراؑ کی طرف بڑھائی اور عجب فخر کے انداز میں کہا، کہ لو یہ تلوار، آج اس نے میرے ساتھ وفاداری کی حد کر دی۔ رسولؐ نے ارشاد کیا کہ لو فاطمہؑ علیؑ کے ہاتھ سے تلوار کو لو۔ آج تمھارے شوہر نے جو اُن کا فرض تھا وہ بڑے نازک مرحلہ پر ادا کیا اور اللہ نے انہی کی تلوار سے قریش کے بڑے بڑے آدمیوں کا خاتمہ کرایا۔ فاطمہ زہراؑ نے خاموشی کے ساتھ ان باتوں کو سُنا، تلوار ہاتھ میں لی اور یقیناً ان باتوں سے انھوں نے خود بھی ایک طرح کا فخر محسوس کیا جس کے ساتھ انھیں ایسی عظیم منزلِ جہاد میں بذاتِ خود شریک نہ ہونے کا کوئی افسوس بھی نہ تھا اس لیے کہ وہ سمجھتی تھیں کہ ان کا جہاد یہی ہے جسے وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں رہ کے اسی طرح پورے طور پر ہمیشہ ادا کیا کرتی ہیں۔ جس طرح علیؑ نے ان جنگوں میں جہاد کا فرض ادا کیا، ہاں صرف ایک موقع عیسائیوں کے مقابلہ میں پُرامن روحانی جہاد یعنی مباہلہ کا ایسا تھا جہاں سیدۂ عالمؑ خدا کے حکم سے برقع و چادر میں نہاں ہو کر اپنے باپ اور شوہر کے ساتھ گھر سے باہر نکلیں جس کا واقعہ یہ تھا کہ یمن سے عیسائیوں کے علمار کا ایک وفد رسولؐ کے پاس بحث و مباحثہ کے لیے آیا اور کئی دن ان سے بحث ہوتی رہی جس سے حقیقت ان پر روشن تو ہو گئی مگر سخن پروری کی بنا پر وہ قائل نہ ہونا تھے نہ ہوئے۔ اس وقت قرآن کی آیت اتری کہ اے رسولؐ اتنے سچے دلائل کے بعد بھی یہ نہیں مانتے تو ان سے کہو کہ پھر آجاؤ" ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو ہم اپنی عورتوں

---

[1] ارشاد شیخ مفید رہ

بلائیں تم اپنی عورتوں کو ہم اپنے نفسوں کو بلائیں تم اپنے نفسوں کو اور اللہ کی طرف رجوع کریں اور جھوٹوں کے لیے اللہ کی لعنت یعنی عذاب کی بددعا کریں "۔ عیسائی علماء پہلے تو اس کے لیے تیار ہو گئے مگر جب رسول اللہؐ تشریف لے گئے اس شان سے کہ حسنؑ اور حسینؑ ایسے بیٹے فاطمہ زہراؑ ایسی خاتون اور علیؑ ایسے نفس کو اپنے ساتھ لیے ہوئے تھے تو عیسائیوں نے مباہلہ سے انکار کر دیا اور مخصوص شرائط پر صلح کر کے واپس گئے۔ اس طرح فاطمہ زہراؑ نے ثابت کر دیا کہ ان کا معیار پردہ بھی جس کی وہ پابند ہیں، بر بنائے عادت نہیں بلکہ بر بنائے فرض ہے۔ اس لیے کسی مستثنیٰ صورت میں اللہ کا حکم ظاہری صورت میں ان کے عام دستورِ زندگی کے خلاف فریضہ عائد کرے تو اس کی تعمیل بھی ان کے لیے ویسی ہی خوشگوار ہے جیسی اپنے عام دستور کی پابندی۔

رسولؐ کا برتاؤ

حضرت فاطمہ زہراؑ کے اوصاف و کمالات ہی کا نتیجہ تھا کہ رسولؐ فاطمہ زہراؑ کے ساتھ محبت بھی انتہائی فرماتے تھے اور آپ کی عزت بھی ایسی کرتے تھے جیسی اپنی بیٹی کی عزت کوئی دوسرا باپ نہیں کیا کرتا۔

محبت کے مظاہروں میں سے ایک یہ تھا کہ جب آپ کسی غزوہ پر تشریف لے جاتے تھے تو سب سے آخر میں فاطمہ زہراؑ سے رخصت ہونے تشریف لاتے تھے اور جب واپس آتے تھے تو سب سے پہلے فاطمہ زہراؑ کے دیکھنے کو تشریف لاتے تھے۔

اور عزت و احترام کا مظاہرہ یہ ہے کہ جب فاطمہؑ آتی تھیں تو آپ تعظیم کو کھڑے ہو جاتے تھے اور اپنی جگہ پر لا کر بٹھاتے تھے۔ یہ برتاؤ رسولؐ کا فاطمہ زہراؑ کے سوا کسی دوسرے شخص سے نہ تھا۔

فضائل

سیدۂ عالمؑ کی فضیلت میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتنی حدیثیں وارد ہیں

جنتی حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے سوا کسی دوسری شخصیت کے لیے نہیں ملتیں۔ ان میں سے اکثر علمائے اسلام میں متفقہ حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً آپ "بہشت میں جانے والی عورتوں کی سردار ہیں"، "ایمان لانے والی عورتوں کی سردار ہیں"، "تمام جہان کی عورتوں کی سردار ہیں"، "آپ کی رضا سے اللہ راضی ہوتا ہے اور آپ کی ناراضگی سے ناراض ہوتا ہے"، "جس نے آپ کو ایذا دی اس نے رسولؐ کو ایذا دی"۔ آپ کا نام فاطمہؑ اس لیے ہوا ہے کہ خدا نے آپ کی بدولت آپ کو دوست رکھنے والوں کو عذابِ جہنم سے چھڑا دیا ہے۔ "فطم" کے معنی چھڑانے کے ہیں۔ فاطمہ کے معنی ہوئے "چھڑانے والی"۔ اس طرح کی بکثرت حدیثیں ہیں جو معتبر کتابوں میں درج ہیں۔

وفاتِ رسولؐ

بعثت کے ۲۳ برس اور ہجرت کے دس برس بعد جب فاطمہ زہراؑ ۱۸ برس کی تھیں آپ کے شفیق اور عزت کرنے والے قدر دان باپ نے دنیا سے رحلت فرمائی، اس صدمہ کا اثر فاطمہ زہراؑ نے اتنا لیا جتنا کسی بیٹی نے کبھی اپنے باپ کی وفات کا اثر نہیں لیا ہے۔

نوحہ و بکا

رسولؐ کی وفات کے بعد سیدۂ عالمؑ جتنے دن زندہ رہیں، کبھی کسی نے آپ کو ہنستے یا مسکراتے نہیں دیکھا بلکہ برابر باپ کے غم میں روتی رہیں اور آپ اتنے پُر درد طریقہ پر نوحہ کرتی تھیں کہ آس پاس کے رہنے والے بھی شدید طور پر متاثر ہوتے تھے۔

ناگوار حالات

افسوس ہے کہ وہ فاطمہؑ جن کی تعظیم کو رسولؐ کھڑے ہو جاتے تھے بعد رسولؐ اہلِ زمانہ کا رخ اپنی طرف سے پھرا ہوا محسوس کرتی تھیں۔ علیؑ بن ابی طالبؑ سے خلافت

کا ہٹایا جانا ہی سیدہؑ کے لیے کیا کم تھا کہ آپ سے بیعت کا سوال بھی کیا جانے لگا اور صرف سوال ہی نہیں بلکہ جبر و تشدّد سے کام لیا جانے لگا۔ انتہا ہے کہ سیّدہ عالمؑ کے گھر پر لکڑیاں جمع کردی گئیں اور آگ لگائی جانے لگی۔ اس وقت کے صدمہ و زحمت کی شدّت وہ تھی جسے جسمانی حیثیت سے سیّدہؑ برداشت نہ کرسکیں اور وہی آپ کی وفات کا سبب ہوا۔ ان صدموں کی شدت سیّدہؑ کی زبان پر جاری ہونے والے اس شعر سے ظاہر ہے کہ ؎

صُبّتْ علیّ مصائبُ لو انّھا
صبّت علی الایّام صرن لیالیا

"یعنی مجھ پر وہ مصیبتیں پڑی ہیں کہ اگر وہ دِنوں پر پڑتیں تو وہ رات ہو جاتے"

فدک

سیّدہؑ کو جو جسمانی و روحانی صدمے پہنچے ان میں ایک بڑا اضافہ اس سے ہو گیا کہ فدک کی جائداد جو رسولؐ نے سیدہ عالمؑ کو مرحمت فرمائی تھی اسے بعدِ رسولؐ ضبط کرلیا گیا۔ جائداد کا چلا جانا سیدہؑ کے لیے اتنی تکلیف کا باعث نہ ہوسکتا تھا جتنا کہ آپ کے دعوے کو حکومت کی طرف سے غلط قرار دیا جانا۔ یہ وہ صدمہ تھا جس کا اثر سیدہؑ کے دل پر مرتے دم تک رہا۔

وصیتیں

حضرت فاطمہ زہراؑ نے طبقہ خواتین کے لیے پردہ کی یادگار اہمیت اس وقت بھی قائم کی جب آپ دنیا سے رخصت ہونے والی تھیں۔ اس طرح کہ آپ ایک دن غیر معمولی طور پر فکر مند نظر آئیں۔ آپ کی چچی (جعفر طیارؓ کی بیوہ) اسماء بنتِ عمیسؓ نے سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے جنازہ کے اٹھانے کا یہ دستور اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ عورت کی میت کو بھی تختہ پر اٹھایا جاتا ہے جس سے اس کا قد و قامت نظر

maablib.org

آتا ہے۔ اسمؓا نے کہا میں نے ملک حبشہ میں ایک طریقہ جنازہ اٹھانے کا دیکھا ہے وہ غالباً آپ کو پسند ہوگا۔ اس کے بعد انھوں نے تابوت کی ایک شکل بنا کر دکھائی اس پر سیدۂ عالمؑ بہت خوش ہوئیں اور پیغمبرؐ کے بعد صرف یہ ایک موقع ایسا تھا کہ آپ کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی چنانچہ آپ نے وصیت فرمائی کہ آپ کو اسی طرح کے تابوت میں اٹھایا جائے۔ مورخین تصریح کرتے ہیں کہ سب سے پہلی لاش جو تابوت میں اٹھی ہے وہ حضرت فاطمہ زہراؑ کی تھی اس کے علاوہ آپ نے یہ وصیت بھی فرمائی تھی کہ آپ کا جنازہ پردۂ شب میں اٹھایا جائے اور ان لوگوں کو اطلاع نہ دی جائے جن کے طرزِ عمل نے آپ کے دل میں زخم ڈال دیئے تھے اور جن سے انتہائی ناراضگی کے عالم میں آپ دنیا سے رخصت ہوئیں۔

وفات

آخر سیدۂ عالمؑ نے اپنے والد بزرگوار رسولِ خداؐ کی وفات کے ۳ مہینہ بعد تیسری جمادی الثانی ۱۱ھ میں وفات پائی۔ آپ کی وصیّت کے مطابق آپ کا جنازہ رات کو اٹھایا گیا۔ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ نے تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ صرف بنی ہاشم اور سلمانؓ اور مقدادؓ و عمارؓ ایسے مخلصین کے ساتھ نماز جنازہ ادا کی اور خاموشی کے ساتھ دفن کر دیا۔ آپ کے دفن کی اطلاع بھی عام طور سے لوگوں کو نہیں ہوئی جس کی بنا پر یہ اختلاف رہ گیا کہ آپ جنت البقیع میں دفن ہیں یا اپنے ہی مکان میں جو بعد کو مسجد رسولؐ کا جزو بن گیا جنت البقیع میں جو آپ کا روضہ تھا وہ بھی باقی نہیں رہا بلکہ ۸ شوال ۱۳۴۴ھ کو ابن سعود نے دوسرے مقابر اہلبیتؑ کے ساتھ اسے بھی منہدم کرا دیا۔

maablib.org

MAAB 1431
maablib.org

ہمارے دوسرے امام

حضرتِ حسن مجتبیٰ علیہ السلام

نام و نسب

حسنؑ نام، مجتبیٰ لقب اور ابو محمد کنیت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معزز بیٹی حضرت فاطمہ زہراؑ کے بطن سے حضرت امیرالمومنین علیؑ بن ابی طالبؑ کے بڑے فرزند تھے۔

ولادت

۱۵ رمضان المبارک کو ہجرت کے تیسرے سال آپؑ کی ولادت ہوئی رسولؐ کے گھر میں آپ کی پیدائش اپنی نوعیت کی پہلی خوشی تھی، جب مکہ معظمہ میں رسولؐ کے بیٹے یکے بعد دیگرے دنیا سے جاتے رہے اور سوائے لڑکی کے آپ کی اولاد میں کوئی نہ رہا تو مشرکین طعنے دینے لگے اور آپ کو بڑا صدمہ پہنچا اور آپ کی تسلّی کے لیے قرآن مجید میں سورۂ کوثر نازل ہوئی جس میں آپ کو خوش خبری دی گئی کہ خدا نے آپ کو کثرتِ اولاد عطا فرمائی ہے اور مقطوع النسل آپ نہیں بلکہ آپ کا دشمن ہوگا۔

حضرت امام حسن علیہ السلام کی مدینہ میں آنے کے تیسرے ہی سال پیدائش گویا سورۂ کوثر کی پہلی تفسیر تھی۔ دنیا جانتی ہے کہ انہی امام حسنؑ اور ان کے چھوٹے بھائی امام حسینؑ علیہ السلام کے ذریعہ سے اولادِ رسولؐ کی وہ کثرت ہوئی کہ باوجود ان کوششوں کے جو دشمنوں کی طرف سے اس خاندان کے ختم کرنے کی ہمیشہ ہوتی رہیں جن میں ہزاروں کو سولی دے دی گئی۔ ہزاروں تلوار سے قتل کیے گئے اور کتنوں کو زہر دیا گیا۔ اس کے

باوجود آج تک دنیا آلِ رسولؐ کی نسل سے چھلک رہی ہے۔ عالم کا کوئی گوشہ مشکل سے ایسا ہوگا جہاں اس خاندان کے افراد موجود نہ ہوں۔ جبکہ رسولؐ کے دشمن جن کی اُس وقت کثرت سے اولاد موجود تھی ایسے فنا ہوئے کہ نام ونشان بھی ان کا کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ ہے قرآن کی سچائی اور رسولؐ کی صداقت کا زندہ ثبوت جو دنیا کی آنکھوں کے سامنے ہمیشہ کے لیے موجود ہے اور اس لیے امام حسن علیہ السلام کی پیدائش سے پیغمبر کو ویسی ہی خوشی نہیں ہوئی جیسی ایک نانا کو نواسے کی ولادت سے ہونا چاہیے۔ بلکہ آپ کو خاص مسرت یہ ہوئی کہ آپ کی سچائی کی پہلی نشانی دنیا کے سامنے آئی۔

ساتویں دن عقیقہ کی رسم ادا ہوئی اور پیغمبرؐ نے بحکم خدا اپنے اس فرزند کا نام حسنؑ رکھا۔ یہ نام اسلام کے پہلے نہیں ہوا کرتا تھا۔ یہ سب سے پہلے پیغمبرؐ کے اسی فرزند کا نام قرار پایا۔ حسینؑ ان کے چھوٹے بھائی کا نام بھی بس انہی سے مخصوص تھا۔ ان کے پہلے کسی کا یہ نام نہ ہوا تھا۔

تربیت

حضرت امام حسن علیہ السلام کو تقریباً آٹھ برس اپنے نانا رسول اللہؐ کے سایہ عاطفت میں رہنے کا موقع ملا۔ رسالت مآبؐ اپنے اس نواسے سے جتنی محبت فرماتے تھے اس کے واقعات دیکھنے والوں نے ہمیشہ یاد رکھے۔ اکثر حدیثیں محبت اور فضیلت کی حسنؑ اور حسینؑ دونوں صاحبزادوں میں مشترک ہیں مثلاً حسنؑ اور حسینؑ جوانانِ بہشت کے سردار ہیں۔" "دونوں گوشوارۂ عرش ہیں۔" "یہ دونوں میرے گلدستے ہیں۔" "خداوندا میں ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں تو بھی ان کو محبوب رکھنا" اور اس طرح کے بے شمار ارشادات پیغمبرؐ کے دونوں نواسوں کے بارے میں کثرت سے ہیں۔ اُن کے علاوہ ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ اولاد کی نسبت باپ کی جانب ہوتی ہے مگر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے ان دونوں نواسوں کی یہ خصوصیت صراحت کے ساتھ بتائی کہ انھیں میرا نواسا ہی نہیں بلکہ میرا فرزند کہنا درست ہے۔

یہ حدیث حضرتؐ کی تمام اسلامی حدیث کی کتابوں میں درج ہے۔ حضرتؐ نے فرمایا" خدا نے ہر شخص کی اولاد کو خود اس کے صُلب سے قرار دیا اور میری اولاد کو اس نے علیؑ ابن ابی طالبؑ کی صلب سے قرار دیا۔ پھر بھلا ان بچوں کی تربیت میں پیغمبرؐ کس قدر اہتمام صرف کرنا ضروری سمجھتے ہوں گے جب کہ خود بچے بھی وہ تھے جنھیں قدرت نے طہارت و عصمت کا لباس پہنا کر بھیجا تھا۔ ایک طرف آئینے اتنے صاف اس پر رسولؐ کے ہاتھ کی جلا نتیجہ یہ تھا کہ بچے کم سنی ہی میں نانا کے اخلاق و اوصاف کی تصویر بن گئے۔ خود حضرتؐ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ حسنؑ میں میرا رعب و داب اور شانِ سرداری ہے اور حسینؑ میں میری سخاوت اور میری جرأت ہے۔ شانِ سرداری گو مختصر سا لفظ ہے مگر اس میں بہت سے اوصاف و کمال کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ اس کے ساتھ مختلف صورتوں سے رسولؐ نے بحکمِ خدا اپنے مشن کے کام میں ان کو اسی بچپن کے عالم میں شریک بھی کیا جس سے یہ ثابت بھی ہوا کہ پیغمبرؐ اپنے بعد بمنشاالٰہی حفاظتِ اسلام کی مہم کو اپنے ہی اہلبیتؑ کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا ایک موقع مباہلہ کے میدان میں تھا۔ حضرت حسنؑ بھی اپنے نانا کے ساتھ ساتھ تھے۔

۲۸ ربیع الاوّل ۱۱ھ کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات ہو گئی اور امام حسن علیہ السلام اس مسرت اور اطمینان کی زندگی سے محروم ہوئے۔ نانا کی وفات کے تھوڑے ہی دن بعد امام حسنؑ کو اپنی مادرِ گرامی حضرت فاطمہ زہراؑ کی وفات کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ اب حسنؑ کے لیے گہوارہ تربیت اپنے مقدس باپ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کی ذات تھی۔ حسنؑ اسی دور میں جوانی کی حدوں تک پہنچے اور کمالِ شباب کی منزلوں کو طے کیا۔ پچیس برس کی خانہ نشینی کے بعد جب حضرت علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام کو مسلمانوں نے خلیفہ ظاہری کی حیثیت سے تسلیم کیا اور اس کے بعد جمل، صفین اور نہروان کی لڑائیاں ہوئیں تو ہر ایک جہاد میں حسن علیہ السلام اپنے والد بزرگوار کے ساتھ ساتھ تھے بلکہ بعض موقعوں پر جنگ میں آپ نے کارنمایاں بھی دکھلائے۔

خلافت

۲۱ رماہ رمضان ۴۰ھ میں حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی وفات ہوئی۔ اس وقت تمام مسلمانوں نے مل کر حضرت امام حسن علیہ السلام کی خلافت تسلیم کی۔ آپ پر اپنے والد بزرگوار کی شہادت کا بڑا اثر تھا۔ سب سے پہلا خطبہ جو آپ نے ارشاد فرمایا اس میں حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کے فضائل و مناقب تفصیل کے ساتھ بیان کیے۔ جناب امیرؑ کی سیرت اور مال دنیا سے پرہیز کا تذکرہ کیا۔ اس وقت آپ پر گریہ کا اتنا غلبہ ہوا کہ گلے میں پھندا پڑ گیا اور تمام لوگ بھی آپ کے ساتھ بے اختیار رونے لگے۔ پھر آپ نے اپنے ذاتی اور خاندانی فضائل بیان کیے۔ عبداللہ ابن عباسؓ نے کھڑے ہو کر تقریر کی اور لوگوں کو بیعت کی دعوت دی۔ سب نے انتہائی خوشی اور رضامندی کے ساتھ بیعت کی آپ نے مستقبل کے حالات کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے اسی وقت لوگوں سے صاف صاف یہ شرط کر دی کہ "اگر میں صلح کروں تو تم کو صلح کرنا ہوگی اور اگر میں جنگ کروں تو تمھیں میرے ساتھ مل کر جنگ کرنا ہوگی"۔ سب نے اس شرط کو قبول کر لیا۔ آپ نے انتظامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیا۔ اطراف میں عمّال مقرر کیے۔ حکّام متعین کیے اور مقدمات کے فیصلے کرنے لگے۔ یہ وقت وہ تھا کہ دمشق میں حاکمِ شام معاویہ کا تختِ سلطنت پر قبضہ مضبوط ہو چکا تھا۔ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کے ساتھ صفین میں جو لڑائیاں حاکمِ شام کی ہوئی تھیں ان کا نتیجہ تحکیم کی سازشانہ کارروائی کی بدولت حاکمِ شام کے موافق نکل چکا تھا ادھر حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی سلطنت کے اندر جہاں اب حضرت امام حسنؑ حکمران ہوئے تھے باہمی تفرقے اور بددلی پیدا ہو چکی تھی۔ خود جناب امیرؑ کے احکام کی تعمیل میں جس طرح کوتاہیاں کی جاتی تھیں وہ حضرت کے آخرِ عمر کے خطبوں سے ظاہر ہے۔ خوارج نہروان کا فتنہ مستقل طور پر بے اطمینانی کا باعث بنا ہوا تھا جن کی اجتماعی طاقت کو اگرچہ نہروان میں شکست ہو گئی تھی مگر ان کے منتشر افراد اب بھی ملک کے امن و امان کو صدمہ پہنچانے پر تلے ہوتے تھے یہاں تک کہ بظاہر اسی جماعت کا

ایک شخص تھا جس نے حضرت امیرؑ کے سر پر مسجد میں ضربت لگائی اور جس کے صدمہ سے آپ کی وفات ہوئی تھی۔

ابھی ملک حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے غم میں سوگوار تھا اور حضرت امام حسنؑ پورے طور پر انتظامات بھی نہ کر چکے تھے کہ حاکم شام کی طرف سے آپ کی مملکت میں دراندازی شروع ہو گئی اور ان کے خفیہ کارکنوں نے اپنی کاروائیاں جاری کر دیں چنانچہ ایک شخص قبیلہ حمیر کا کوفہ میں اور ایک شخص بنی قین میں سے بصرہ میں پکڑا گیا یہ دونوں اس مقصد سے آئے تھے کہ یہاں کے حالات سے دمشق میں اطلاع دیں اور فضا کو امام حسنؑ کے خلاف ناخوشگوار بنائیں غنیمت ہے کہ اس کا انکشاف ہو گیا حمیر والا آدمی کوفہ میں ایک قصائی کے گھر سے اور قین والا آدمی بصرہ میں بنی سلیم کے یہاں گرفتار کیا گیا اور دونوں کو جرم کی سزا دی گئی۔ اس واقعہ کے بعد حضرت امام حسنؑ نے معاویہ کو ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ تم اپنی دراندازیوں سے نہیں باز آتے۔ تم نے لوگ بھیجے ہیں کہ میرے ملک میں بغاوت پیدا کرائیں اور اپنے جاسوس یہاں پھیلا دیئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ تم جنگ کے خواہشمند ہو ایسا ہو تو پھر تیار رہو یہ منزل کچھ دور نہیں ہے۔ نیز مجھ کو خبر ملی ہے کہ تم نے میرے باپ کی وفات پر طعن و تشنیع کے الفاظ کہے۔ یہ ہرگز کسی ذی ہوش آدمی کا کام نہیں ہے۔ موت سب کے لیے ہے آج ہمیں اس حادثے دوچار ہونا پڑا تو کل تمھیں ہو گا اور حقیقت یہ ہے کہ "ہم اپنے مرنے والے کو مرنے والا سمجھتے نہیں۔ وہ تو ایسا ہے۔ جیسے ایک منزل سے منتقل ہو کر اپنی دوسری منزل میں جا کر آرام کی نیند سو جائے۔"

اس خط کے بعد حاکم شام اور امام حسنؑ کے درمیان بہت سے خطوط کی ردو بدل ہوئی۔ حاکم شام کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ سے اہل کوفہ کے باہمی تفرقہ اور بددلی اور عملی کمزوریوں کا علم ہو گیا۔ اس لیے وہ سوچے کہ یہی موقع ہے کہ عراق پر حملہ کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ اپنی فوجوں کو لے کر عراق کے حدود تک پہنچ گئے۔ اس وقت حضرت امام حسنؑ نے بھی مقابلہ کی تیاری کی اور حجر بن عدی کو بھیجا کہ وہ دورہ کر کے اطراف ملک کے حکام کو مقابلے کے لیے

آمادہ کریں اور لوگوں کو جہاد کے لیے تیار کریں مگر جو خیال تھا وہی ہوا کہ عام طور پر سرد مہری سے کام لیا گیا۔ تھوڑی فوج تیار ہوئی تو ان میں کچھ فرقہ خوارج کے لوگ تھے کچھ شورش پسند اور مالِ غنیمت کے طلبگار اور کچھ لوگ۔ صرف اپنے سردارانِ قبائل کے دباؤ سے شریک تھے۔ بہت کم وہ لوگ تھے جو واقعی حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے شیعہ سمجھے جا سکتے تھے۔

ادھر معاویہ نے عبداللہ ابن عامر ابن کریز کو آگے روانہ کیا اور اس نے مقام انبار میں جا کر چھاؤنی چھائی۔ ادھر حضرت امام حسنؑ اس کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوئے اور مقامِ دیر کعب کے قریب ساباط میں قیام کیا۔ یہاں پہنچ کر آپ نے لوگوں کی حالت کا جائزہ لینے کے لیے سب کو جمع کر کے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس کا مضمون یہ تھا کہ "دیکھو مجھے کسی مسلمان سے کینہ نہیں ہے۔ میں تمہارا اتنا ہی بہی خواہ ہوں جتنا خود اپنی ذات کی نسبت مجھے ہونا چاہیے۔ میں تمہارے بارے میں ایک فیصلہ کن رائے قائم کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ تم میری رائے سے انحراف نہ کرو گے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں سے اکثر کی ہمت جہاد سے پست ہو گئی ہے اور میں کسی طرح یہ صحیح نہیں سمجھتا کہ تمہیں بادل ناخواستہ کسی مہم پر مجبور کروں"۔ اس تقریر کا ختم ہونا تھا کہ مجمع میں ہنگامہ پیدا ہو گیا۔ یقینی علیؑ ایسے بہادر باپ کا بہادر فرزند تن تنہا اس ہنگامہ آور جماعت کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ اگر یہ کھلم کھلا دشمنوں کی جماعت ہوتی مگر اس کے پہلے خود حضرت علیؑ بھی اس وقت بظاہر بے بس ہو گئے تھے۔ جب نیزوں پر قرآن اونچے کیے جانے کے بعد صفین میں خود آپ کی فوج کے آدمی آپ کو گھیر کر کھڑے ہو گئے تھے کہ آپ جنگ کو روک دیجیئے۔ نہیں تو ہم آپ کو قید کر کے دشمن کے سپرد کر دیں گے۔ اس وقت جناب امیرؑ نے ایسا نہیں کیا کہ تلوار لے کر ان سے لڑنے لگتے بلکہ مجبوراً جنگ کو ملتوی فرمایا۔ اس سے زیادہ سخت صورت سے اس وقت امام حسنؑ کو سامنا کرنا پڑا کہ مجمع نے آپ پر حملہ کر دیا اور مصلّیٰ قدم کے نیچے سے کھینچ لیا۔ چادر آپ کے دوش سے اتار لی۔ آپ گھوڑے پر سوار ہوئے اور آواز بلند کی کہ کہاں ہیں ربیعہ اور ہمدان، فوراً یہ دونوں جانثار قبیلے ادھر اُدھر سے دوڑ پڑے اور لوگوں کو آپ سے دور کیا۔ آپ یہاں سے مدائن کی طرف روانہ ہوئے مگر

جراح ابن قبیصہ اسدی ایک شخص انہی خوارج میں سے کمین گاہ میں چھپ گیا اور اس نے آپ پر خنجر سے حملہ کیا جس سے آپ کی ران زخمی ہوگئی۔ حملہ آور گرفتار کیا گیا اور اسے سزا دی گئی۔ عرصہ تک مدائن میں علاج ہونے کے بعد آپ اچھے ہوئے اور پھر معاویہ کی فوج سے مقابلہ کی تیاری کی۔

صلح

حاکم شام کو حضرت امام حسنؑ کی فوج کی حالت اور لوگوں کی بے وفائی کا حال معلوم ہو چکا تھا اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ امام حسن علیہ السلام کے لیے جنگ کرنا ممکن نہیں ہے مگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ حضرت امام حسنؑ کتنے ہی بے بس اور بے کس ہوں مگر وہ علیؑ و فاطمہؑ کے بیٹے اور پیغمبرؐ کے نواسے ہیں اس لیے وہ ایسے شرائط پر ہرگز صلح نہ کریں گے جو حق پرستی کے خلاف ہوں اور جن سے باطل کی حمایت ہوتی ہو۔ اس کو نظر میں رکھتے ہوئے انھوں نے ایک طرف تو آپ کے ساتھیوں کو عبداللہ ابن عامر کے ذریعے سے یہ پیغام دلوایا کہ اپنی جان کے پیچھے نہ پڑو اور خونریزی نہ ہونے دو۔ اس سلسلے میں کچھ لوگوں کو رشوتیں بھی دی گئیں اور کچھ بزدلوں کو اپنی تعداد کی زیادتی سے خوف زدہ کیا گیا اور دوسری طرف امام حسنؑ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ جن شرائط پر کہیں انہی شرائط پر میں صلح کے لیے تیار ہوں۔

امام حسنؑ یقیناً اپنے ساتھیوں کی غداری کو دیکھتے ہوئے جنگ کرنا مناسب نہ سمجھتے تھے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ ضرور پیش نظر تھا کہ ایسی صورت پیدا ہو کہ باطل کی تقویت کا دھبا میرے دامن پر نہ آنے پائے۔ اس گھرانے کو حکومت و اقتدار کی ہوس تو کبھی تھی ہی نہیں۔ انھیں تو مطلب اس سے تھا کہ مخلوقِ خدا کی بہتری ہو اور حدود و حقوق الٰہی کا اجرا ہو اب معاویہ نے جو آپ سے منہ مانگے شرائط پر صلح کرنے کے لیے آمادگی ظاہر کی تو اب مصالحت سے انکار کرنا شخصی اقتدار کی خواہش کے علاوہ اور کچھ نہیں قرار پا سکتا تھا۔ یہ کہ حاکم شام صلح کے شرائط پر عمل نہ کریں گے بعد

کی بات تھی۔ جب تک صلح نہ ہوتی یہ انجام سامنے آ کہاں سکتا تھا اور حجت تمام کیونکر ہو سکتی تھی۔ پھر بھی آخری جواب دینے سے قبل آپ نے ساتھ والوں کو جمع کیا اور تقریر فرمائی: "آگاہ رہو کہ تم میں دو خونریز لڑائیاں ہو چکی ہیں۔ جن میں بہت لوگ قتل ہوئے کچھ مقتول صفین میں ہوئے جن کے لیے آج تک رو رہے ہو اور کچھ مقتول نہروان کے جن کا معاوضہ طلب کر رہے ہو، اب اگر تم موت پر راضی ہو تو ہم اس پیغام صلح کو قبول نہ کریں اور ان سے اللہ کے بھروسے پر تلواروں سے فیصلہ کرائیں اور اگر زندگی کو دوست رکھتے ہو تو ہم اس کو قبول کر لیں اور تمہاری مرضی پر عمل کریں"، جواب میں لوگوں نے ہر طرف سے پکارنا شروع کیا کہ "ہم زندگی چاہتے ہیں۔ آپ صلح کر لیجیے"۔ اس کا نتیجہ تھا کہ آپ نے صلح کے شرائط مرتب کر کے معاویہ کے پاس روانہ کیے۔

شرائط صلح

اس صلحنامہ کے مکمل شرائط حسب ذیل تھے۔

۱۔ یہ کہ معاویہ حکومتِ اسلام میں کتاب خدا اور سنتِ رسولؐ پر عمل کریں گے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی خلیفہ کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

۳۔ یہ کہ شام و عراق و حجاز و یمن سب جگہ کے لوگوں کے لیے امان ہوگی۔

۴۔ یہ کہ حضرت علیؑ کے اصحاب اور شیعہ جہاں بھی ہیں ان کے جان و مال اور ناموس و اولاد محفوظ رہیں گے۔

۵۔ معاویہ حسنؑ ابن علیؑ اور ان کے بھائی حسینؑ ابن علیؑ اور خاندانِ رسولؐ میں سے کسی کو بھی کوئی نقصان پہنچانے یا ہلاک کرنے کی کوشش نہ کریں گے نہ خفیہ طریقہ پر اور نہ اعلانیہ اور ان میں سے کسی کو کسی جگہ دھمکایا اور ڈرایا نہیں جائے گا۔

۶۔ جناب امیر علیہ السلام کی شان میں کلماتِ نازیبا جو اب تک مسجد جامع اور قنوت نماز میں استعمال ہوتے رہے ہیں وہ ترک کر دیئے جائیں۔ آخری شرط کی منظوری

میں معاویہ کو عذر ہوا تو یہ طے پایا کہ کم از کم جس موقع پر امام حسنؑ موجود ہوں اس موقع پر ایسا نہ کیا جائے۔ یہ معاہدہ ربیع الاول یا جمادی الاول ۴۱ھ کو عمل میں آیا۔

صلح کے بعد

فوجیں واپس چلی گئیں۔ معاویہ کی شہنشاہی ممالک اسلامیہ میں عمومی طور پر مسلّم ہو گئی اور اب شام و مصر کے ساتھ عراق و حجاز، یمن اور ایران نے بھی اطاعت کر لی۔ حضرت امام حسن علیہ السلام کو اس صلح کے بعد اپنے بہت سے ساتھیوں کی طرف سے جس طرح کے دلخراش اور توہین آمیز الفاظ کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کا برداشت کرنا انہی کا کام تھا۔ وہ لوگ جو کل تک امیر المومنین کہہ کے تسلیم بجالاتے تھے آج "مُذل المومنین" "یعنی مومنین کی جماعت کو ذلیل کرنے والے" کے الفاظ سے سلام کرنے لگے پھر بھی امام حسنؑ نے صبر و استقلال اور نفس کی بلندی کے ساتھ ان تمام ناگوار حالات کو برداشت کیا اور معاہدہ پر سختی کے ساتھ قائم رہے مگر ادھر یہ ہوا کہ حاکمِ شام نے جنگ کے ختم ہوتے ہی اور سیاسی اقتدار کے مضبوط ہوتے ہی عراق میں داخل ہو کر نخیلہ میں جسے کوفہ کی سرحد سمجھنا چاہیے قیام کیا اور جمعہ کے خطبہ کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ "میرا مقصد جنگ سے کوئی یہ نہ تھا کہ تم لوگ نماز پڑھنے لگو۔ روزے رکھنے لگو۔ حج کر دیا زکوٰۃ ادا کرو۔ یہ سب تو تم کرتے ہی ہو میرا مقصد تو بس یہ تھا کہ میری حکومت تم پر مسلّم ہو جائے اور یہ مقصد میرا حسنؑ کے اس معاہدہ کے بعد پورا ہو گیا اور باوجود تم لوگوں کی ناگواری کے خدا نے مجھے کامیاب کر دیا۔ رہ گئے وہ شرائط جو میں نے حسنؑ کے ساتھ کیے ہیں وہ سب میرے پیروں کے نیچے ہیں ان کا پورا کرنا یا نہ کرنا میرے ہاتھ کی بات ہے" مجمع میں ایک سناٹا چھایا ہوا تھا مگر اب کس میں دم تھا کہ وہ اس کے خلاف زبان کھولتا۔ انتہا ہے کہ کوفہ میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی موجودگی میں حاکم شام نے حضرت امیرؑ اور امام حسنؑ کی شان میں کلماتِ نازیبا استعمال کیے جن کو سن کر امام حسینؑ بھائی کی جانب سے جواب دینے کے لیے کھڑے ہو گئے

مگر امام حسنؑ نے آپ کو بٹھا دیا اور خود کھڑے ہو کر نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں حاکم شام کی تقریر کا جواب دیا اسی طرح جتنی معاہدہ کی شرطیں تھیں حاکم شام نے سب کی مخالفت کی اور کسی ایک پر بھی عمل نہیں کیا۔

باوجودیکہ آپ بالکل خاموشی کی زندگی گزار رہے تھے مگر آپ خود بھی اس دور میں بنی امیہ کی ایذا رسانیوں سے محفوظ نہیں تھے۔ ایک طرف غلط پروپیگنڈے اور بے بنیاد الزامات جن سے ان کی بلندی مرتبہ پر عام نگاہوں میں حرف آئے مثلاً کثرت ازدواج اور کثرتِ طلاق یہ چیز اپنی جگہ پر شریعتِ اسلام میں جائز ہے مگر بنی امیہ کے پروپیگنڈے نے اس کو حضرت امام حسنؑ کی نسبت ایسے ہولناک طریقہ پر پیش کیا جو ہرگز قابلِ قبول نہیں ہے۔ دوسرے بنی امیہ کے ہواخواہوں کا بُرا برتاؤ، سخت کلامی اور دشنام دہی اس کا اندازہ امام حسینؑ کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو آپ نے مروان سے فرمائے تھے۔ جب امام حسنؑ کے جنازے کے ساتھ مروان رو رہا تھا۔ امام حسینؑ نے فرمایا "آج تم روتے ہو، حالانکہ اس کے پہلے تم انھیں غم و غصہ کے گھونٹ پلاتے تھے جنھیں دل ہی خوب جانتا ہے۔" مروان نے کہا۔ ٹھیک ہے مگر وہ سب کچھ ایسے انسان کے ساتھ کرتا تھا جو اس پہاڑ سے زیادہ قوتِ برداشت رکھنے والا تھا۔

اخلاق و انصاف

امام حسنؑ کی ایک غیر معمولی صفت جس کے دوست اور دشمن سب معترف تھے۔ وہ یہی حلم کی صفت تھی جس کا اقرار ابھی مروان کی زبان سے آپ سن چکے ہیں۔ حکومتِ شام کے ہواخواہ صرف اس لیے جان بوجھ کر سخت کلامی اور بدزبانی کرتے تھے کہ امام حسنؑ کو غصہ آجائے اور کوئی ایسا اقدام کر دیں جس سے آپ پر عہد شکنی کا الزام عائد کیا جا سکے اور اس طرح خونریزی کا ایک بہانہ ہاتھ آئے مگر آپ ایسی صورتوں میں حیرتناک قوتِ برداشت سے کام لیتے تھے جو کسی دوسرے انسان کا کام نہیں ہے۔ آپ کی سخاوت اور مہمان نوازی بھی عرب میں مشہور تھی۔ آپ نے تین مرتبہ اپنا تمام

مال راہِ خدا میں لٹا دیا اور دو مرتبہ اپنی تمام ملکیت۔ یہاں تک کہ اثاث البیت اور لباس تک کو آدھوں آدھ راہِ خدا میں دے دیا۔

سائلوں کو ایک دفعہ میں ہزاروں روپے دے دیئے ہیں اور حقیقت میں معاویہ کے ساتھ شرائطِ صلح میں جو بہت سے مورخین کے بیان کے مطابق ایک خاص رقم کی شرط ملتی ہے کہ معاویہ کی جانب سے ہر سال امام حسن علیہ السلام کے پاس روانہ کی جائے وہ اگر صحیح ہو تو اس کا مقصد صرف یہی تھا کہ اس ذریعہ سے مسلمانوں کے بیت المال کا کچھ روپیہ مستحقین تک بھی پہنچ سکے، ہرگز اپنی ذات پر صرف کرنے کے لیے آپ نے اس رقم کی شرط قرار نہیں دی تھی چنانچہ جو کچھ پاس موجود ہوتا تھا چاہے زیادہ سے زیادہ رقم کیوں نہ ہو آپ فوراً سائلوں کو عطا فرما دیتے تھے۔ کسی نے آپ سے پوچھا کہ باوجودیہ کہ آپ خود ضرورت مند ہیں پھر بھی کیا بات ہے کہ سائل کو رد نہیں فرماتے، آپ نے فرمایا: "میں خود خدا کی بارگاہ کا سائل ہوں، مجھے شرم آتی ہے کہ خود سائل ہوتے ہوئے دوسرے سائلوں کے سوال کے پورا ہونے کی تمنا رکھوں"۔

اس کے ساتھ آپ کے علمی کمالات بھی وہ تھے جن کے سامنے دنیا سر خم کرتی تھی۔ اگرچہ عبداللہ بن عباسؓ امیر المومنینؑ سے حاصل کیے ہوئے علوم سے دنیائے علم میں اپنا ڈنکا بجا رہے تھے مگر جب امام حسنؑ کے خداداد علم کا سامنا ہو جاتا تھا تو خاندانِ رسالت کی بزرگی کا دنیا کو اقرار کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ایک سائل نے مسجد نبوی میں آکر ایک آیت کی تفسیر ابن عباسؓ سے بھی پوچھی۔ عبداللہ ابنؓ عمر سے بھی پوچھی اور پھر امام حسنؑ سے دریافت کی اور آخر میں اس نے اقرار کیا کہ امام حسن علیہ السلام کا جواب یقیناً ان دونوں سے بہتر تھا۔ اکثر آپ نے اپنے دشمن معاویہ کے دربار اور وہاں کے مخالف ماحول میں فضائل اہلبیتؑ اور مناقب امیر المومنینؑ پر ایسی موثر تقریریں فرمائی ہیں کہ دشمنوں کے سر جھک گئے اور آپ کی فصاحت و بلاغت اور حقانیت کا ان کے دلوں پر سکہ قائم ہو گیا۔

عبادت بھی آپ کی امتیازی حیثیت رکھتی تھی بیس یا پچیس حج پاپیادہ کیے جب موت،

قبر، قیامت اور صراط کو یاد فرماتے تھے تو رونے لگتے تھے۔ جب بارگاہِ الٰہی میں اعمال کے پیش ہونے کا خیال آتا تھا تو ایک نعرہ مار کر بے ہوش ہو جاتے تھے اور جب نماز کو کھڑے ہوتے تھے تو جسم لرزنے لگتا تھا۔

وفات

اس بے ضرر اور خاموش زندگی کے باوجود بھی امام حسن علیہ السلام کے خلاف وہ خاموش حربہ استعمال کیا گیا جو سلطنتِ بنی امیہ میں اکثر صرف کیا جا رہا تھا۔ حاکم شام نے اشعث ابن قیس کی بیٹی جعدہ کے ساتھ جو حضرت امام حسن علیہ السلام کی زوجیت میں تھی ساز باز کر کے ایک لاکھ درہم انعام اور اپنے فرزند یزید کے ساتھ شادی کا وعدہ کیا اور اس کے ذریعہ سے حضرت حسنؑ کو زہر دلوایا۔ امام حسنؑ کے کلیجے کے ٹکڑے ہو گئے اور حالت خراب ہوئی۔ آپ نے اپنے بھائی حضرت امام حسینؑ کو پاس بلایا اور وصیت کی، اگر ممکن ہو تو مجھے جدِ بزرگوار رسولِ خداؐ کے جوار میں دفن کرنا لیکن اگر مزاحمت ہو تو ایک قطرہ خون گرنے نہ پائے۔ میرے جنازے کو واپس لے آنا اور جنت البقیع میں دفن کرنا۔ ۲۸ صفر ۵۰ھ کو امام حسنؑ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ حسینؑ حسبِ وصیت بھائی کا جنازہ روضہ رسولؐ کی طرف لے گئے مگر جیسا کہ امام حسنؑ کو اندیشہ تھا وہی ہوا۔ ام المومنین عائشہؓ ـــــ اور مروان وغیرہ نے مخالفت کی۔ نوبت یہ پہنچی کہ مخالف جماعت نے تیروں کی بارش کر دی اور کچھ تیر جنازۂ امامِ حسنؑ تک پہنچے، بنی ہاشم کے اشتعال کی کوئی انتہا نہ تھی مگر امام حسین علیہ السلام نے بھائی کی وصیت پر عمل کیا اور امام حسن علیہ السلام کا تابوت واپس لا کر جنت البقیع میں دفن کر دیا۔

maablib.org

تیسرے امام

حضرت سید الشہداء ابو عبداللہ الحسین علیہ السلام

نام و نسب

حسینؑ نام اور ابو عبداللہ کنیت ہے۔ پیغمبر خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چھوٹے نواسے اور علیؑ و حضرت فاطمہ زہراؑ کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔

ولادت

ہجرت کے چوتھے سال تیسری شعبان پنجشنبہ کے دن آپ کی ولادت ہوئی۔ اس خوشخبری کو سُن کر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے، بیٹے کو گود میں لیا، داہنے کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہی اور اپنی زبان منہ میں دے دی۔ پیغمبرؐ کا مقدس لعاب دہن حسینؑ کی غذا بنا۔ ساتویں دن عقیقہ کیا گیا۔ آپ کی پیدائش سے تمام خاندان میں خوشی اور مسرت محسوس کی جاتی تھی مگر آنے والے حالات کا علم پیغمبرؐ کی آنکھوں سے آنسو برساتا تھا۔ اور اسی وقت سے حسینؑ کے مصائب کا چرچا اہلبیتِ رسولؐ کے زبانوں پر آنے لگا۔

maablib.org

نشوونما

پیغمبرِ اسلامؐ کی گود جو اسلام کی تربیت کا گہوارہ تھی اب ان دو بچوں کی پرورش میں مصروف ہوئی ایک حسنؑ دوسرے حسینؑ اور اس طرح ان دونوں کا اور اسلام کا ایک ہی گہوارہ تھا جس میں دونوں پروان چڑھ رہے تھے۔ ایک طرف پیغمبرِ اسلام

بن کی زندگی کا مقصد ہی اخلاق انسانی کی تکمیل تھی اور دوسری طرف حضرت امیرالمومنین علیؑ ابن ابی طالبؑ جو اپنے عمل سے خدا کی مرضی کے خریدار بن چکے تھے تیسری طرف حضرت فاطمہ زہراؑ جو خواتین کے طبقہ میں پیغمبرؐ کی رسالت کو عملی طور پر پہنچانے کے لیے ہی قدرت کی طرف سے پیدا ہوئی تھیں اس نورانی ماحول میں حسینؑ کی پرورش ہوئی۔

رسولؐ کی محبت

جیسا کہ حضرت امام حسنؑ کے حالات میں لکھا جا چکا ہے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دونوں نواسوں کے ساتھ انتہائی محبت فرماتے تھے۔ سینہ پر بٹھاتے تھے۔ کاندھوں پر چڑھاتے تھے اور مسلمانوں کو تاکید فرماتے تھے کہ ان سے محبت رکھو۔ مگر چھوٹے نواسے کے ساتھ آپ کی محبت کے انداز کچھ امتیاز خاص رکھتے تھے۔ ایسا ہوا ہے کہ نماز میں سجدہ کی حالت میں حسینؑ پشتِ مبارک پر آگئے تو سجدہ میں طول دیا۔ یہاں تک کہ بچہ خود سے بخوشی پشت پر سے علیحدہ ہوگیا۔ اس وقت سر سجدے سے اٹھایا اور کبھی خطبہ پڑھتے ہوئے حسینؑ مسجد کے دروازے سے داخل ہونے لگے اور زمین پر گر گئے تو رسولؐ نے اپنا خطبہ قطع کر دیا اور منبر سے اتر کر بچے کو زمین سے اٹھایا اور پھر منبر پر تشریف لے گئے اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ "دیکھو یہ حسینؑ ہے اسے خوب پہچان لو اور اس کی فضیلت کو یاد رکھو" رسولؐ نے حسینؑ کے لیے یہ الفاظ بھی خاص طور سے فرماتے تھے کہ "حسین مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں"۔ مستقبل نے بتا دیا کہ رسولؐ کا مطلب یہ تھا کہ میرا نام اور میرا کام دنیا میں حسین علیہ السلام کی بدولت قائم رہیگا۔

رسولؐ کی وفات کے بعد

امام حسین علیہ السلام کی عمر ابھی چھ سال کی تھی جب انتہائی محبت کرنے والے نانا کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اب پچیس برس تک حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی خانہ نشینی

کا دور ہے۔ اس زمانہ کے طرح طرح کے ناگوار حالات امام حسینؑ دیکھتے رہے اور اپنے والد بزرگوار کی سیرت کا بھی مطالعہ فرماتے رہے۔ یہ ہی وہ دور تھا جس میں آپ نے جوانی کے حدود میں قدم رکھا اور بھرپور شباب کی منزلوں کو طے کیا۔ ۳۵ھ میں جب حسینؑ کی عمر ۳۱ برس کی تھی عام مسلمانوں نے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کو بحیثیت خلیفہ اسلام تسلیم کیا۔ یہ امیرالمومنینؑ کی زندگی کے آخری پانچ سال تھے جن میں جمل صفین اور نہروان کی لڑائیاں ہوئیں اور امام حسینؑ ان میں اپنے بزرگ مرتبہ باپ کی نصرت اور حمایت میں شریک ہوتے اور شجاعت کے جوہر بھی دکھائے۔ ۴۰ھ میں جناب امیر علیہ السلام مسجد کوفہ میں شہید ہوئے اور اب امامت و خلافت کی ذمہ داریاں امام حسنؑ کے سپرد ہوئیں جو حضرت امام حسینؑ کے بڑے بھائی تھے۔ حسینؑ نے ایک باوفا اور اطاعت شعار بھائی کی طرح حسنؑ کا ساتھ دیا اور جب امام حسنؑ نے اپنے شرائط کے ماتحت جن سے اسلامی مفاد محفوظ رہ سکے معاویہ کے ساتھ صلح کر لی تو امام حسینؑ بھی اس مصلحت پر راضی ہو گئے اور خاموشی کی زندگی گزارنے لگے۔ دس برس تک امام حسنؑ کے بعد آپ خاموشی اور گوشہ نشینی کے ساتھ عبادت اور شریعت کی تعلیم و اشاعت میں مصروف رہے مگر معاویہ نے ان شرائط کو جو امام حسنؑ کے ساتھ ہوتے تھے بالکل پورا نہ کیا خود امام حسن علیہ السلام کو سازش ہی سے زہر دیا گیا حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے شیعوں کو چُن چُن کے قید کیا گیا۔ سر قلم کیے گئے اور سولی پر چڑھایا گیا اور سب سے آخر اس شرط کے بالکل خلاف کہ "معاویہ کو اپنے بعد کسی کو جانشین مقرر کرنے کا حق نہ ہوگا" معاویہ نے یزید کو اپنے بعد کے لیے ولی عہد بنا دیا اور تمام مسلمانوں سے اس کی بیعت حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور زور و زر دونوں طاقتوں کو کام میں لا کر دنیائے اسلام کے بڑے حصے کا سر جھکوا دیا گیا۔

اخلاق و اوصاف

امام حسین علیہ السلام سلسلہ امامت کے تیسرے فرد تھے عصمت و طہارت کا مجسمہ

تھے۔ آپ کی عبادت، آپ کے زہد، آپ کی سخاوت اور آپ کے کمالِ اخلاق کے دوست و دشمن سب ہی قائل تھے۔ پچیس حج آپ نے پاپیادہ کیے۔ آپ میں سخاوت اور شجاعت کی صفت کو خود رسولؐ اللہ نے بچپنے میں ایسا نمایاں پایا کہ فرمایا "حسینؑ میں میری سخاوت اور میری جرأت ہے"۔ چنانچہ آپ کے دروازے پر مسافروں اور حاجتمندوں کا سلسلہ برابر قائم رہتا تھا اور کوئی سائل محروم واپس نہیں ہوتا تھا۔ اس وجہ سے آپ کا لقب ابوالمساکین ہوگیا تھا۔ راتوں کو روٹیوں اور کھجوروں کے پشتارے اپنی پیٹھ پر اٹھا کرلے جاتے تھے اور غریب محتاج بیواؤں اور یتیم بچوں کو پہنچاتے تھے جن کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے تھے (حضرتؑ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ "جب کسی صاحبِ ضرورت نے تمھارے سامنے سوال کے لیے ہاتھ پھیلادیا تو گویا اس نے اپنی عزت تمھارے ہاتھ بیچ ڈالی۔ اب تمھارا فرض یہ ہے کہ تم اسے خالی ہاتھ واپس نہ کرو، کم سے کم اپنی ہی عزتِ نفس کا خیال کرو"۔

غلاموں اور کنیزوں کے ساتھ آپ عزیزوں کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر آپ انھیں آزاد کر دیتے تھے۔ آپ کے علمی کمالات کے سامنے دنیا کا سر جھکا ہوا تھا۔ مذہبی مسائل اور اہم مشکلات میں آپ کی طرف رجوع کی جاتی تھی۔ آپ کی دعاؤں کا ایک مجموعہ صحیفہ حسینیہ کے نام سے اس وقت بھی موجود ہے آپ رحمدل ایسے تھے کہ دشمنوں پر بھی وقت آنے پر رحم کھاتے تھے اور ایثار ایسا تھا کہ اپنی ضرورت کو نظر انداز کرکے دوسروں کی ضرورت کو پورا کرتے تھے۔ ان تمام بلند صفات کے ساتھ متواضع اور منکسر ایسے تھے کہ راستے میں چند مساکین بیٹھے ہوتے اپنے بھیک کے ٹکڑے کھارہے تھے اور آپ کو پکار کر کھانے میں شرکت کی دعوت دی تو حضرت فوراً زمین پر بیٹھ گئے۔ اگرچہ کھانے میں شرکت نہیں فرمائی۔ اس بنا پر کہ صدقہ آلِ محمدؐ پر حرام ہے مگر ان کے پاس بیٹھنے میں کوئی عذر نہیں ہوا۔

اس خاکساری کے باوجود آپ کی بلندی مرتبہ کا یہ اثر تھا کہ جس مجمع میں آپ تشریف فرما ہوتے تھے لوگ نگاہ اٹھا کر بات نہیں کرتے تھے (جو لوگ آپ کے خاندان کے

مخالف تھے وہ بھی آپ کی بلندیٔ مرتبہ کے قائل تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے حاکم شام معاویہ کو ایک سخت خط لکھا جس میں اُس کے اعمال و افعال اور سیاسی حرکات پر نکتہ چینی کی تھی اس خط کو پڑھ کر معاویہ کو بڑی تکلیف محسوس ہوئی۔ پاس بیٹھنے والے خوشامدیوں نے کہا کہ آپ بھی اتنا ہی سخت خط لکھیے معاویہ نے کہا "میں جو کچھ لکھوں وہ اگر غلط ہو تو اس سے کوئی نتیجہ نہیں اور اگر صحیح لکھنا چاہوں تو بخدا حسینؑ میں مجھے ڈھونڈے سے کوئی عیب نہیں ملتا۔"

آپ کی اخلاقی جرأت، راست بازی اور راست کرداری، قوتِ اقدام، جوشِ عمل اور ثبات واستقلال، صبر و برداشت کی تصویریں کربلا کے مرقع میں محفوظ ہیں۔ اس سب کے ساتھ آپ کی امن پسندی یہ تھی کہ آخر وقت تک دشمن سے صلح کرنے کی کوشش جاری رکھی مگر عزم وہ تھا کہ جان دے دی جو صحیح راستہ پہلے دن اختیار کر لیا تھا اس سے ایک انچ نہ ہٹے۔ انھوں نے بحیثیت ایک فرزند کے باپ کی اطاعت کی اور چھوٹے بھائی ہو کر بھائی کی اطاعت کی اور پھر بحیثیت ایک سردار کے کربلا میں ایک پوری جماعت کی قیادت کی۔ اس طرح کہ اپنے وقت میں وہ اطاعت بھی بے مثل اور دوسرے وقت میں یہ قیادت بھی لاجواب تھی۔

واقعۂ کربلا

حضرت امام حسن علیہ السلام اور حاکمِ شام معاویہ بن ابوسفیان میں جو صلح ہوئی تھی اس کی ایک خاص اہم شرط یہ تھی کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی جانشین کے مقرر کرنے کا حق نہ ہوگا مگر سب شرطوں کو عملی طور سے پائمال کرتے ہوئے معاویہ نے اس شرط کی بھی نہایت شدت کے ساتھ مخالفت کی اور اپنے بیٹے یزید کو اپنے بعد کے لیے نامزد کرنا کیا، بلکہ اپنی زندگی ہی میں ممالکِ اسلامیہ کا دورہ کر کے بحیثیت آیندہ خلیفہ کے یزید کی بیعت حاصل کر لی۔ اس وقت حضرت امام حسین علیہ السلام نے بیعت سے انکار فرما دیا۔ حاکم شام نے آپ کو موافق بنانے میں ہر طرح کی کوشش کی مگر نتیجہ ناکامیابی

ہوئی۔ یزید نہ صرف یہ کہ اصولی طور پر اس کی خلافت ناجائز تھی بلکہ اپنے اخلاق اوصاف اور کردار کے لحاظ سے اتنا پست تھا کہ تختِ سلطنت پر اس کا برقرار ہونا اسلامی شریعت کے لیے سخت خطرے کا باعث تھا۔ وہ شرابخوار، بدکار اور ایسے اخلاقی جرائم کا مرتکب تھا جن کا ذکر بھی تہذیب اور شائستگی کے خلاف ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ وہ حضرت امام حسین علیہ السلام سے بیعت لینے پر مصر تھا گویا وہ اپنے خلافِ شریعت افعال کی صحت کے لیے پیغمبرِ اسلامؐ کے نواسے سے سند حاصل کرنا چاہتا تھا۔

معاویہ کے مرنے کے بعد جب یزید تخت پر بیٹھا تو سب سے پہلی فکر اس کو یہی ہوئی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام سے بیعت حاصل کی جائے۔ اس نے اپنے گورنر کو جو مدینہ میں تھا معاویہ کی خبرِ انتقال کے ساتھ بیعت کے لیے بھی لکھا ولید نے جو مدینہ کا گورنر تھا امام حسینؑ کو بلا کر یزید کا پیغام پہنچایا۔ آپ پہلے ہی سے یہ طے کیے ہوتے تھے کہ یزید کی بیعت آپ کے لیے ہرگز ممکن نہیں ہے۔ بیعت نہ کرنے کی صورت میں جو نتائج ہوں گے انھیں بھی خوب جانتے تھے مگر دینِ خدا کی حفاظت اور شریعتِ اسلام کی خاطر آپ کو سب گوارا تھا۔ آپ ولید کو مناسب جواب دے کر اپنے مکان پر واپس آ گئے۔ مدینہ میں قیام اس کے بعد نامناسب خیال فرما کر ہجرت کا مضبوط ارادہ کر لیا۔

۶۰ھ رجب کا مہینہ ۲۸ تاریخ تھی جب حضرتؑ اپنے نانا کے جوار کو چھوڑ کر ظالموں کے جور و ستم سے سفرِ غربت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ مکہ معظمہ عرب کے بین الاقوامی قانون اور پھر اسلامی تعلیمات کے رو سے جائے پناہ اور امن و امان کی جگہ تھی۔ آپ نے مکہ میں ایک پناہ گزین کی حیثیت سے قیام فرمایا آپ کے ساتھ آپ کے قریبی اعزہ تھے جن میں خاندانِ رسولؐ کی محترم بی بیاں اور کمسن بچے بھی تھے۔ آپ اپنی طرف سے کسی خونریزی اور جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ حج کا زمانہ بھی قریب تھا اور حضرتؑ کی دلی تمنا تھی کہ اس سال خانہ کعبہ کا حج ضرور فرمائیں جبکہ آپ مکہ ہی میں موجود ہیں مگر اسباب ایسے پیدا ہوئے کہ وہ بزرگوار جو اس کے پہلے پچیس حج خانہ کعبہ

کے اپنے وطن مدینہ سے آکر پاپیادہ بجالاچکا تھا اس وقت مکہ میں موجود ہونے پر بھی حج کرنے سے مجبور ہو گیا۔ ظالم حکومتِ شام کی طرف سے کچھ لوگ حاجیوں کے لباس میں بھیجے گئے کہ وہ جس حالت میں بھی موقع ملے حضرت امام حسینؑ کو خانہ کعبہ کے پاس ہی قتل کر ڈالیں۔

حضرتؑ نہ چاہتے تھے کہ آپ کی وجہ سے مکہ کے اندر خونریزی ہو اور خانہ کعبہ کی حرمت برباد ہو۔ دو روز حج کو باقی تھے جب آپ تمام اہل وعیال اور اعزہ کے ساتھ مکہ معظمہ سے روانہ ہو گئے۔ اب آپ کہاں جاتے۔ کوفہ کے لوگ برابر خط بھیج رہے تھے کہ آپ یہاں تشریف لائیں اور ہماری مذہبی رہنمائی فرمائیں جبکہ آپ مکہ سے نکلنے پر مجبور ہو چکے تھے تو اب کوفہ ہی وہ مقام ہو سکتا تھا جس کی طرف آپ رخ کرتے۔ یہاں کے حالات کو دیکھنے کے لیے آپ اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیلؑ کو بھیج چکے تھے۔ ۸ ذی الحجہ کو حضرتؑ مکہ معظمہ سے کوفہ کے ارادے سے روانہ ہوئے مگر یہی وہ وقت تھا جب کوفہ میں انقلاب ہو چکا تھا۔ شروع میں تو کوفہ کے لوگوں نے حضرت مسلمؑ کا خیر مقدم کیا اور ۱۸ ہزار آدمیوں نے بیعت کی مگر جب یزید کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے حاکمِ کوفہ نعمان ابن بشیر کو معزول کیا اور ابن زیاد کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا۔

یہ شخص بڑا ہی ظالم اور تشدد پسند تھا۔ اس نے کوفہ میں آکر بڑے سخت احکام نافذ کیے اور تمام اہل کوفہ پر خوف و دہشت طاری ہو گئی۔ سب نے جناب مسلمؑ کا ساتھ چھوڑ دیا اور آخر تن تنہا ہزاروں کا مقابلہ کرنے کے بعد بڑی مظلومی اور بے کسی کے ساتھ ۹ ذی الحجہ کو وہ شہید کر ڈالے گئے۔ حضرت امام حسینؑ عراق کے راستے میں منزل زبالہ میں تھے جب حضرتؑ کو مسلمؑ کی خبر شہادت معلوم ہوئی اس کا حضرتؑ پر بڑا اثر پڑا مگر عزم و استقلال میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ واپسی کا بھی کوئی موقع نہ تھا۔ سفر جاری رہا۔ یہاں تک کہ ذو حسم کی منزل میں ابن زیاد کی فوج میں سے ایک ہزار کا لشکر حرؓ بن یزید ریاحی کی سرداری میں آپ کا راستہ روکنے کے لیے پہنچ گیا۔ یہ دشمن کی فوج تھی مگر حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان کے ساتھ رحم و کرم کا وہ مظاہرہ فرمایا جو دنیا کے

انسانیت میں یادگار رہے گا۔ تمام فوج کو پیاسا دیکھ کر جتنا پانی ساتھ تھا۔ وہ سب پلا دیا اور ان بے آب راستوں میں اپنے اہل حرم اور بچوں کی پیاس کے لحاظ سے پانی کا کوئی ذخیرہ محفوظ نہ رکھا۔ اس کے بعد بھی یزیدی فوج نے اپنے حاکم کی ہدایت کے موافق آپ کے ساتھ تشدد اختیار کیا۔ آپ کو آگے بڑھنے یا واپس جانے سے روک دیا۔ اب ۶۱ھ کا پہلا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ دوسری محرم کو حضرتؑ کربلا کی زمین پر پہنچے اور یہیں اترنے پر مجبور ہو گئے۔ دوسرے دن سے یزید کا ٹڈی دل لشکر کربلا کے میدان میں آنا شروع ہو گیا اور تمام راستے بند کر دیئے گئے۔

امام حسین علیہ السلام کے ساتھ صرف ۷۲ جانباز تھے اور ادھر ہزاروں کا لشکر پہلے سات دن تک امن قائم رکھنے کے لیے صلح کی کوشش ہوتی رہی۔ حضرتؑ یہاں تک تیار ہوئے کہ عرب کا ملک چھوڑ دیں۔ کسی دور دراز زمین پر چلے جائیں اور اس طرح اپنے کو بیعتِ یزید سے الگ رکھتے ہوئے بھی ایسی صورت پیدا کر دیں کہ جنگ کی ضرورت پیش نہ آئے۔ مگر نویں محرم کی سہ پہر کو صلح کے امکانات ختم ہو گئے۔ ابن زیاد کے اس خط سے جو شمر کے ہاتھ عمر سعد کے پاس بھیجا گیا اس میں لکھا تھا "یا حسینؑ غیر مشروط طور پر اطاعت قبول کریں یا ان سے جنگ کی جائے۔" اس خط کے پہنچتے ہی یزیدی فوج نے حملہ کر دیا۔

باوجودیکہ ساتویں سے پانی بند ہو چکا تھا امام حسین علیہ السلام کے سامنے ان کے اہل حرم اور چھوٹے بچوں کی بے تابی کے مناظر، العطش کی صدائیں اور مستقبل کے حالات سب ہی کچھ تھے۔ مگر یزید کی بیعت اب بھی اسی طرح غیر ممکن تھی جس طرح اس کے پہلے بے شک آپ نے یہ چاہا کہ ایک رات کی مہلت مل جائے۔ آپ چاہتے تھے کہ یہ پوری رات آخری طور پر عبادت خدا میں بسر کریں۔ اس کے علاوہ دوست و دشمن دونوں کو جنگ کا قطعی فیصلہ ہو جانے کے بعد اپنے طرزِ عمل پر غور کرنے کا موقع مل جائے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے تقریر بھی فرمائی۔ آپ نے فرمایا "کل قربانی کا دن ہے ان ظالموں کو مجھ سے دشمنی ہے، کیا ضرورت ہے کہ تم لوگ بھی

اپنی زندگی کو میرے ساتھ خطرے میں ڈالو۔ میں تم سے اپنی بیعت اٹھائے لیتا ہوں۔ اس رات کے پردے میں جدھر چاہو چلے جاؤ۔" مگر ان جانبازوں نے ایک زبان ہو کر کہا کہ "ہم آپ کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے۔"

عاشورہ کی رات ختم ہوئی۔ دسویں محرم کو صبح سے عصر تک کی مدت میں ان بہادروں نے جو کچھ کہا تھا اسے کر کے دکھایا۔ اس وفاداری، استقلال اور بہادری کے ساتھ حضرت امام حسین علیہ السلام کی نصرت میں دشمنوں سے مقابلہ کیا جو تاریخ میں یادگار رہے گا۔ ان میں حبیب ابن مظاہرؓ، مسلمؓ ابن عوسجہ، سویدؓ ابن عمرو، انسؓ بن حارث اور عبدالرحمنؓ ابن عبدالرب ایسے ساٹھ ستر اور اسی برس کے بڈھے تھے اور متعدد اصحابِ رسولؐ بھی تھے۔ بریرؓ ہمدانی کنانہؓ ابن عتیق تغلبی، نافعؓ ابن بلال، حنظلہؓ ابن اسعد ایسے حفاظِ قرآن تھے اور بہت سے علماء اور راویانِ حدیث، بہت سے عابدِ شب زندہ دار اور بہت سے ایسے شجاعانِ روزگار تھے جن کی شجاعت کے کارنامے لوگوں کی زبان پر تھے۔

جب مددگاروں میں کوئی باقی نہ رہا تو عزیزوں کی نوبت آئی۔ سب سے پہلے حضرتؑ نے جوان بیٹے علی اکبرؑ کو جو شبیہِ پیغمبرؐ بھی تھے مرنے کے لیے بھیج دیا علی اکبرؑ نے جہاد کر کے اپنی جان دینِ خدا پر نثار کی۔ امام حسین علیہ السلام کو شبیہِ رسولؐ کی جدائی کا صدمہ تو بہت ہوا مگر عمل کے راستے میں آپ کی ہمت کے حوصلے اور ولولے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ عقیل کی اولاد عبداللہ ابن جعفر کے فرزند ایک ایک کر کے رخصت ہوتے۔ امام حسنؑ کے یتیم قاسمؑ کی جدائی آپ کو بہت شاق ہوئی مگر اپنے بزرگ مرتبہ بھائی کی وصیت کو پورا کرتے ہوئے قاسمؑ کو بھی رخصت کر دیا۔

سب کے آخر میں فرزندان امیر المومنین علیہ السلام میدانِ جہاد میں گئے، جب کوئی نہ رہا تو علمدارؑ کی باری آئی۔ قمر بنی ہاشم ابوالفضل العباسؑ کو حضرتؑ کسی طرح اجازت جہاد نہ دیتے تھے کیونکہ ان کے کاندھوں پر اسلام کا علم لہرا رہا تھا۔ مگر ایک طرف بچوں کی پیاس، دوسری طرف جوشِ جہاد، عباسؑ پانی لینے کے لیے ایک مشک اپنے ساتھ لے کر

فرات کی جانب متوجہ ہوئے۔ انھوں نے عَلَم کی حفاظت بھی کی۔ دشمنوں سے مقابلہ بھی کیا۔ فوج کو ہٹا کر نہر کا راستہ بھی صاف کیا اور مشک میں پانی بھی بھر لیا مگر افسوس کہ یہ پانی خیام حسینی تک پہنچنے نہیں پایا تھا کہ بہادر علمدارؑ کے شانے قلم ہوئے۔ مشک تیر سے چھدی اور پانی زمین پر بہا۔ عباسؑ کی قوت ختم ہوگئی۔ گرز کے صدمے سے زمین کی طرف جھکے اور علم عباسؑ کے ساتھ زمین پر آگیا۔ حسینؑ کی کمر شکستہ ہوگئی۔ پشت جھک گئی مگر ہمت پھر بھی نہیں ٹوٹی۔ اب جہاد کے میدان میں حسینؑ کے سوا کوئی نظر نہ آتا تھا مگر فہرستِ شہدا میں ابھی ایک بے مثال مجاہد کا نام باقی تھا جس کا جواب قربانی کی تاریخ میں نہ پہلے نظر آیا نہ بعد میں نظر آسکتا ہے۔ یہ چھ مہینے کا بچہ علی اصغرؑ تھا جو گہوارہ میں پیاس سے جاں بلب تھا۔ حسینؑ درِ خیمہ پر تشریف لائے اور اس بچہ کو طلب فرمایا۔ بچہ کی عطش اور اس کی حالت کا مشاہدہ فرمایا۔ یقیناً یہ منظر ہر حساس انسان کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھا مگر کیسے بے رحم تھے وہ سخت دل فوج شام کے سپاہی جنھوں نے حسینؑ کے ہاتھوں پر اس معصوم بچّے کو دیکھ کر بجائے اس کے کہ رحم کھاتے بچّے کو ایک جرعۂ آب سے سیراب کرتے ظلم اور شقاوت کو انتہائی حد تک پہنچادیا۔ سخت دل حرملہ کا تیر اور بچہ کا نازک گلا۔

امام حسینؑ نے یہ آخری ہدیہ بھی بارگاہِ الٰہی میں پیش کر دیا تو خود بہ نفسِ نفیس میدان جہاد میں قدم رکھا اور باوجود اس بے کسی اور تشنگی کے جب کہ تین دن کے بھوکے اور پیاسے تھے دن بھر اصحاب و اعزہ کی لاشیں اٹھائی تھیں اور بہتّر داغ سینہ پر کھا چکے تھے۔ بھائی کے غم سے کمر شکستہ تھی اور اولاد کے داغ سے کلیجہ زخمی ہوگیا تھا۔ مگر جب نصرتِ اسلام کے لیے تلوار نیام سے نکالی تو دنیا کو حمزہؑ اور جعفرؑ کی شان اور حیدرِ صفدرؑ کی شجاعت یاد دلادی۔ آخر قربانی کی منزل سامنے آگئی۔ دشمنوں کی تلواریں نیزے اور تیر اور وہ مقدس جسم زخموں کی کثرت، خون کے بہنے سے گھوڑے پر سنبھلنے کی طاقت نہ رہی۔ دشمنوں نے ایذارسانی کی کوئی حسرت باقی نہ رکھی۔ شمر کا خنجر فرزندِ رسولؐ کے گلے پر کیا پھرا گویا رسولؐ کا سر قلم ہوا اور نام نہاد کلمۂ اسلام پڑھنے

والوں نے پیغمبرؐ اسلام کے نواسے کا سر نیزہ پر بلند کیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ خیموں میں آگ لگا دی۔ خانوادۂ عصمت کی مقدس بی بیوں کے سروں سے چادریں اتاری گئیں۔ شہیدوں کی لاشیں گھوڑوں کے سموں سے پامال کی گئیں۔

امام حسین علیہ السلام کے بعد مردوں میں صرف ایک بیمار فرزند سید سجادؑ باقی تھے جنھیں طوق و زنجیر پہنایا گیا اور بی بیوں اور بچوں کے ساتھ قید کر کے شہر بشہر پھرایا گیا۔ کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام قیدیوں کی صورت سے لے جائے گئے اور ابن زیاد اور یزید کے درباروں میں کھڑے کیے گیے ان واقعات کا مختصر تذکرہ حضرت سید سجادؑ کے حالات میں آپ کی نظر سے گزرے گا

ان نام کے مسلمانوں نے پیغمبر اسلامؐ کے فرزند کو دفن وکفن سے بھی محروم رکھا تھا مگر آس پاس کے رہنے والے قبیلہ بنی اسد کے لوگوں نے فوجِ ظلم کے چلے جانے کے بعد بارہ محرم کو یعنی شہادت سے تیسرے دفن کیا۔

آج کربلائے معلی میں حسینؑ کا روضہ انتہائی شان و شوکت کے ساتھ تمام دنیا کے لوگوں کا مرکز بنا ہوا ہے اور حسینؑ کے نام کا تعزیہ اور ضریح اور علم اور مختلف مظاہرات دنیا کے ہر گوشے میں نظر آتے ہیں۔ حسینؑ دنیا میں قائم ہیں اور حسینؑ کی بدولت اسلام باقی ہے اور صداقت و استقلال اور حق پرستی کے لیے امام حسین علیہ السلام کا اسوۂ حسنہ تاریخ انسانیت میں بے مثال حیثیت سے باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

اگر واقعۂ کربلا سے دنیا صحیح سبق حاصل کرے اور سید الشہداء نے کربلا میں جو بے نظیر نمونہ پیش کیا ہے اُس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی جاری رہے تو زندگی کے آثار نمایاں ہو جائیں۔

ہم میں کیا کمی ہے؟ یہی ہے کہ بلند مقاصد کے سامنے اپنے وقتی مفاد اپنے راحت و آرام، اپنی زندگی، اپنی قرابتوں اور اپنے اہل و عیال اور اولاد نہ جانے کتنی روپہلی سنہری مصلحتوں کا لحاظ کرتے ہیں۔

امام حسین علیہ السلام نے یہ مثال پیش کی ہے کہ تم بلند مقاصد کے لیے ہر چیز کو قربان کرنے کے لیے تیار رہو، مبارک ہوں گے وہ افراد جو اس سے سبق حاصل کریں اور اپنے کو عملی حیثیت سے ویسا ہی پیش کریں جیسا حسینؑ دنیا کو بنانا چاہتے تھے۔

MAAB 1431
maablib.org

چوتھے امام

حضرت سیّد السّاجدین زین العابدین علیہ السّلام

نام و نسب

علیؑ نام، اور زین العابدینؑ و سید السّاجدینؑ نام سے زیادہ مشہور لقب ہیں۔ آپ (وہ مخصوص ہستی ہیں جنھوں نے عرب اور عجم دونوں قوموں کی ممتاز شرافتوں کو اپنی ذات میں جمع کر لیا تھا۔ دادھیال کی طرف سے روحانی اقتدار کے وارث ہوئے اور ننھال کی جانب سے ایران کے کسروی خاندان کی شاہانہ ہمت اور بلند اوصاف کے وارث بھی ہوئے) ان کے والد بزرگوار رسولِ خداؐ کے نواسے اور علیؑ و فاطمہؑ کے بیٹے حضرت امام حسینؑ شہید کربلا تھے اور ان کی والدہ آخری تاجدارِ ایران یزدجرد کی بیٹی شاہِ زنان تھیں جو شہر بانوؑ کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ اس وقت کہ جب عرب میں نسلی تعصب انتہا درجہ پر تھا۔ عجم کی شہزادی اسیر ہو کر عرب کے ملک میں آئیں۔ کون تھا جو قومی اور نسلی دشمنی کے ہوتے ہوئے شہنشاہ ایران کی لڑکی کو مناسب عزت و احترام کا درجہ دے سکتا وہ انسانیت کے بڑے علمبردار حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ ہی تھے جنھوں نے ایران کی شہزادی کو اپنے بیٹے حضرت امام حسینؑ کے ساتھ بیاہ کر عرب کی ملکہ بنا دیا اور خدا نے اُنھیں کو حضرت امام زینؑ العابدین کی ماں بننے کا شرف عطا فرمایا۔ اس طرح امام زین العابدینؑ عرب کے سردار حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کے پوتے اور عجم کے شہنشاہ یزدجرد کے نواسے تھے اور اسی لیے عرب و عجم سب ہی کی نگاہ میں بڑی عزت کا درجہ رکھتے تھے۔

ولادت

حضرت علی ابن ابی طالبؑ کوفہ میں مسند خلافت پر متمکن تھے۔ جب ۱۵ جمادی الثانی ۳۸ھ میں سید سجادؑ کی ولادت ہوئی آپ کے دادا حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ اور سارے خاندان کے لوگ اس مولود کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور شاید علیؑ ہی نے پوتے میں اپنے خدوخال دیکھ کر اس کا اپنے نام پر علیؑ نام رکھا۔

تربیت

حضرت امام زین العابدینؑ کو ماں کی محبت بھری پرورش سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں مل سکا اس لیے کہ ان کا آپ کی ولادت کے بعد ہی انتقال ہوگیا تھا۔ اس کے بعد دو برس کا سن تھا جب آپ کے دادا حضرت امیر علیہ السلام کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ امام زین العابدین علیہ السلام اپنے چچا حضرت امام حسن علیہ السلام اور والد امام حسین علیہ السلام کی تربیت کے سایہ میں پروان چڑھے۔ بارہ برس کی آپ کی عمر تھی جب امام حسنؑ کی وفات ہوئی۔ اب امامت کی ذمہ داریاں آپ کے والد حضرت امام حسینؑ سے متعلق تھیں۔ شام کی حکومت پر بنی امیہ کا قبضہ تھا اور واقعات کربلا کے اسباب حسینی جہاد کی منزل کو قریب سے قریب تر لا رہے تھے۔ جب حضرت زین العابدینؑ بلوغ کی منزلوں پر پہنچ کر جوانی کی حدوں میں قدم رکھ رہے تھے۔ زین العابدینؑ نے آنکھیں کھول کر ان واقعات کی رفتار کو آگے ہی بڑھتے ہوئے دیکھا جنھوں نے بعد میں کربلا کی قربانی کو ضروری قرار دیا۔

شادی

اسی زمانہ میں جب کہ امام حسینؑ مدینہ میں خاموشی کی زندگی بسر کر رہے تھے حضرت نے اپنے فرزند سید سجادؑ کی شادی اپنی بھتیجی یعنی حضرت امام حسنؑ کی صاحبزادی

ساتھ کردی جن کے بطن سے امام محمد باقرؑ کی ولادت ہوئی اور اس طرح امام حسینؑ نے اپنے بعد کے لیے سلسلۂ امامت کے باقی رہنے کا سامان خود اپنی زندگی میں کردیا۔

واقعۂ کربلا

۶۰ھ میں سید سجادؑ کی عمر ۲۲ سال کی تھی جب حضرت امام حسینؑ کو عراق کا سفر درپیش ہوا اور سید سجادؑ بھی ساتھ تھے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ راستہ ہی میں یا کربلا پہنچنے کے بعد کہاں آپ بیمار ہوئے اور دس محرم ۶۱ھ کو امام حسینؑ کی شہادت کے موقع پر اس قدر بیمار تھے کہ اٹھنا بیٹھنا مشکل تھا۔ اور یقین ہے کہ ساتویں سے پانی بند ہونے کے بعد پھر سید سجادؑ کے لیے بھی پانی کا ایک قطرہ ملنا ناممکن ہوگیا۔ ایک ایسے بیمار کے لیے یہ تکلیف برداشت سے باہر تھی۔ عاشورہ کے دن کے اکثر حصے میں آپ غشی کے عالم میں رہے اور اسی لیے کربلا کے جہاد میں اس طرح شریک نہ ہو سکے جس طرح ان کے دوسرے بھائی شریک ہوئے اور اسی لئے حضرت امام حسینؑ آخری رخصت کے وقت وہ وصیتیں جو امامت کے منصب سے متعلق تھیں خود سید سجادؑ کے سپرد نہ فرما سکے بلکہ انھیں ایک کاغذ پر لکھ کر اپنی صاحبزادی فاطمہ کبریٰؑ کے سپرد فرمادیا اور کہہ دیا کہ جب تمھارے بھائی ہوش میں آئیں تو انھیں دے دینا۔ قدرت کو سید سجادؑ کا امتحان دوسری طرح لینا تھا۔ وہ حسینؑ کے بعد لُٹے ہوئے قیدیوں کے قافلہ کے سالار بننے والے تھے۔ ادھر امام حسینؑ شہید ہوتے ادھر ظالم دشمنوں نے خیام اہلبیتؑ کی طرف رخ کردیا اور لوٹنا شروع کردیا۔ اس وقت کا اہلِ حرم کا اضطراب خیام میں تہلکہ اور پھر ان ہی خیموں میں آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے اس وقت سید سجادؑ کا کیا عالم تھا۔ اس کے اظہار کے لیے کسی زبان یا قلم کو الفاظ ملنا غیر ممکن ہیں مگر کیا کہنا زین العابدینؑ کی عبادت خدا کا انھوں نے اس بیماری اس مصیبت اور اس آفت میں بھی اپنی عبادت کی شان میں فرق نہ آنے دیا۔ آپ نے گیارھویں محرم کی شب کو نماز فریضہ کے بعد سجدۂ معبود میں خاک پر سر رکھ دیا اور ایک ہی سجدہ میں

پوری رات ختم کر دی۔ سجدہ میں یہ کلمات زبان پر تھے۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ حقاً حقاً۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ایماناً وَّ صِدْقاً لا الٰہ الا اللہ تعبداً ورقاً (یعنی کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے جو حق ہے یقیناً حق ہے، کوئی معبود نہیں سوائے ایک اللہ کے۔ ایمان کی رو سے اور سچائی کی رو سے کوئی معبود نہیں سوائے ایک اللہ کے۔ گواہی دیتا ہوں میں اس کی بندگی اور نیازمندی کے ساتھ) یوں ہی صبح ہوگئی۔

دوسرے دن فوج دشمن کے سالار ابن سعد نے اپنے کشتوں کو جمع کیا اور ان پر نماز پڑھ کر دفن کیا مگر حسینؑ اور اِن کے ساتھیوں کی لاشوں کو اسی طرح بے گور و کفن زمین گرم کربلا پر دھوپ میں چھوڑ دیا۔ یہ موقع سید سجادؑ کے لیے انتہائی تکلیف کا تھا وہ اس وقت جب دشمن کے ہاتھ میں قید ہو کر بہنوں پھوپھیوں اور دیگر اہلِ حرم کے ساتھ مقتل سے گزر رہے تھے تو یہ حالت تھی کہ قریب تھا کہ روح جسم سے جدا ہو جائے۔ انھیں اس کا صدمہ تھا کہ وہ اپنے باپ اور دوسرے عزیزوں کو دفن نہ کر سکے۔ وہ تو دشمنوں کے ہاتھ میں اسیر تھے اور کربلا سے کوفہ لے جائے جا رہے تھے۔

پھر کتنا دل کو بے چین کرنے والا تھا وہ منظر جب خاندانِ رسولؐ کا لٹا ہوا قافلہ دربار ابنِ زیاد میں پہنچا۔ سید سجادؑ محسوس کر رہے تھے کہ یہ وہی کوفہ ہے جہاں ایک وقت میں علیؑ ابن ابی طالبؑ بادشاہ سمجھے جاتے تھے اور زینبؑ وام کلثومؑ شاہزادیاں آج اسی کوفہ میں ظالم ابن زیاد تختِ حکومت پر بیٹھا ہے اور رسولؐ کا خاندان مقیّد کھڑا ہے۔ سیّد سجادؑ ایک بلند انسان کی طرح انتہائی صدمہ اور تکلیف کے ساتھ بھی ایک کوہِ وقار بنے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ ابن زیاد نے اس خاموشی کو توڑا یہ پوچھ کر کہ تمھارا نام کیا ہے؟ امامؑ نے فرمایا "علیؑ ابن الحسینؑ"۔ وہ کہنے لگا "کیا اللہ نے علیؑ ابن الحسینؑ کو قتل نہیں کیا؟" امام نے جواب دیا "وہ میرے ایک بھائی علیؑ تھے جنھیں لوگوں نے قتل کر دیا"۔ وہ سرکش جاہل کہنے لگا "نہیں! بلکہ اللہ نے قتل کیا"۔ امامؑ نے یہ آیت پڑھی کہ "اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا"۔ یعنی اللہ ہی موت کے وقت قبضِ روح کرتا ہے اور اللہ کا قبض روح کرنا یہ الگ بات ہے جو سب

کے لیے ہے[1]۔" اس پر ابن زیاد کو غصہ آگیا اور کہا "تم میں اب بھی مجھ کو جواب دینے اور میری بات رد کرنے کی جرأت ہے؟" اور فوراً قتل کا حکم دیا۔ یہ سننا تھا کہ حضرت زینبؑ دوڑ کر اپنے بھتیجے سے لپٹ گئیں اور کہا کہ "مجھ کو بھی اس کے ساتھ قتل کیا جائے۔" سید سجادؑ نے کہا "پھوپھی چھوڑ دیجئے اور مجھے ابن زیاد کا جواب دینے دیجئے۔" ابن زیاد تو یہ سمجھا تھا کہ کربلا میں آلِ محمدؐ کے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر سید سجادؑ کے دل میں موت کا ڈر سما گیا ہوگا اور وہ قتل کی دھمکی سے سہم جائیں گے مگر بہادر حسینؑ کے بہادر فرزند نے تیور بدل کر کہا "ابن زیاد تو مجھے موت سے ڈراتا ہے؟ کیا ابھی تک تجھے نہیں معلوم کہ قتل ہونا ہماری عادت ہے اور شہادت ہماری فضیلت ہے" یہ وہ پُرزور الفاظ تھے جنھوں نے ظالم کے سر کو جھکا دیا۔ حکم قتل ختم ہوگیا اور ثابت ہوگیا کہ حسینؑ کی شہادت سے ان کی اولاد اہل حرم پر کوئی خوف نہیں چھایا بلکہ قاتل ہی اس خاندان کے صبر و استقلال کو دیکھ کر خوفزدہ ہو چکے ہیں۔ کوفہ کے بعد یہ قافلہ دمشق کی طرف روانہ ہوا جس دن دمشق میں داخلہ تھا اس دن وہاں کے بازار خاص اہتمام سے سجائے گئے تھے اور تمام شہر میں آئینہ بندی کی گئی تھی اور لوگ آپس میں عیدیں مل رہے تھے۔ اس وقت حسینؑ کے اہل حرم جو تکلیف محسوس کر رہے تھے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ ایسے وقت انسان کے ہوش و حواس بجا نہیں رہتے مگر وہ سید سجادؑ تھے جو ہر موقع پر ہدایت و اصلاح اور حسینی مشن کی تبلیغ کرتے جاتے تھے۔ جس وقت یہ قافلہ بازار سے گزر رہا تھا تو اموی حکومت کے ایک ہوا خواہ نے حضرت سجادؑ سے طنزیہ پوچھا۔ اے فرزند حسینؑ کس کی فتح ہوئی؟ آپ نے جواب میں فرمایا "تم کو اگر معلوم کرنا ہے کہ کس کی

---

[1] ابن زیاد کا مقصد اس جملے سے "کیا اللہ نے علی ابن الحسینؑ کو قتل نہیں کیا؟" یہ تھا کہ علیؑ ابن الحسینؑ (علی اکبر) معاذاللہ بحکمِ خدا قتل ہوئے امامؑ نے اس کی تردید کرتے ہوئے جو فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا قتل ہرگز حکم خدا سے نہیں ہوا بلکہ ان کو فوج یزید نے ظلم سے قتل کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مرنے والا اپنی موت سے مرے یا قتل کیا جائے ہر صورت میں قبض روح کرنے والا خدا ہے۔ (ناشر)

فتح ہوئی تو جب نماز کا وقت آئے اور اذان اور اقامت کہی جائے اس وقت سمجھ لینا کہ کس کی فتح ہوئی ؟" اسی طرح اس وقت جب یہ قافلہ مسجدِ دمشق کے دروازہ پر پہنچا تو ایک بوڑھا سامنے آیا اور اس نے قیدیوں کو دیکھ کر کہا کہ شکر ہے اس خدا کا جس نے تم کو تباہ و برباد کیا اور ملک کو تمھارے مردوں سے خالی اور پر امن بنایا۔ اور خلیفۂ وقت یزید کو تم پر غلبہ فرمایا۔ ان اسیروں کے قافلہ سالار حضرت سجادؑ سمجھ گئے کہ یہ ہم لوگوں سے واقف نہیں۔ "فرمایا کہ اے شیخ کیا تم نے یہ آیت قرآن میں پڑھی ہے قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى " کہدو اے رسولؐ کہ میں سوائے اپنے اہلبیتؑ کی محبت کے تم سے اس تبلیغ رسالت پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ بوڑھے نے کہا ہاں یہ آیت میں نے پڑھی ہے، فرمایا وہ رسولؐ کے اہل بیت ہم ہی ہیں جن کی محبت تم پر فرض ہے۔ یوں ہی خمس والی آیت میں جو ذَوِي الْقُرْبٰى کا لفظ ہے اور آیۂ تطہیر میں اہلبیتؑ کا لفظ ہے یہ سب آپ نے اس کو یاد دلایا۔ بوڑھا یہ سن کر تھوڑی دیر حیرت سے خاموش رہا پھر کہا کہ خدا کی قسم تم لوگ وہی ہو ؟ سیّد سجادؑ نے فرمایا۔ ہاں قسم بخدا ہم وہی اہلبیتؑ اور قرابتدار رسولؐ کے ہیں۔ یہ سن کر بوڑھا شیخ رونے لگا۔ عمامہ سر سے پھینک دیا۔ سر آسمان کی طرف بلند کیا اور کہا۔ خداوندا گواہ رہنا کہ میں آل محمدؐ کے ہر دشمن سے بیزار ہوں۔ پھر امامؑ سے عرض کیا۔ "کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے ؟" فرمایا " اگر توبہ کرو تو قبول ہو گی اور ہمارے ساتھ ہو گے۔" اس نے عرض کیا "میں اس جرم سے توبہ کرتا ہوں جو میں نے واقف نہ ہونے کی وجہ سے آپ کی شان میں گستاخی کی۔

کوفہ میں دربار ابن زیاد میں اور پھر بازار کوفہ میں اور پھر دمشق میں یزید کے سامنے سید سجادؑ اور دیگر اہل حرم کی بہادرانہ گفتگو خطبے اور احتجاج وہ تھے جنھوں نے دنیا کو شہادتِ حسینؑ کا مقصد بتایا اور اس طرح امام زین العابدینؑ نے اس مشن کو پورا کیا جسے امام حسین علیہ السلام انجام دے رہے تھے۔

maablib.org

رہائی کے بعد

قیدِ شام سے رہائی کے بعد امام زین العابدینؑ مع اہلِ حرم مدینہ گئے اور خاموش زندگی گزارنا شروع کی مگر مدینہ میں اب یزید کی خلافت کے خلاف جذبات بھڑک چکے تھے۔ ان لوگوں نے کوشش کی کہ امام زین العابدینؑ کو اپنے ساتھ شریک کیا جائے مگر امامؑ ان کی نیت اور ان کے ارادوں کی حالت کو خوب جانتے تھے۔ آپ نے ان کا ساتھ دینا منظور نہیں فرمایا۔ اسی لیے مدینہ پر جب یزید کی فوج نے چڑھائی کی تو امام زین العابدینؑ کو بلاوجہ کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی گئی مگر آپ کے روحانی صدمہ کے لیے یہ ہی کافی تھا کہ رسولؐ اللہ کی مسجد میں تین روز تک گھوڑے بندھے رہے سینکڑوں مسلمان شہید ہوئے اور سینکڑوں شریف عورتوں کی فوج یزید کے ہاتھوں عصمت دری ہوئی۔ یہ مصیبت آپ کے لیے نہایت ناگوار تھی مگر آپ نے صبرو استقلال کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ایسے موقع پر جب کہ شہادت حسینؑ سے ہر طرف انقلاب برپا تھا اور مختلف جماعتیں خونِ حسینؑ کا بدلہ لینے کے لیے کھڑی ہوئی تھیں۔ حضرت امام زین العابدینؑ کا اس ہنگامہ سے الگ رہ کر صرف عبادت اور تعلیماتِ الٰہی کی اشاعت میں مصروف رہنا ایک بڑا حیرتناک ضبطِ نفس کا نمونہ تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سلیمانؓ ابن صرد خزاعی یا مختارؓ ابن ابی عبیدہ ثقفی جنھوں نے قاتلانِ حسینؑ سے انتقام لیا، امام زین العابدینؑ کے دل میں ان کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ موجود تھا۔ آپ نے مختارؓ کے لیے دعائے خیر فرمائی ہے آپ نے برابر لوگوں سے دریافت فرمایا ہے کہ کون کون قاتل حسینؑ کے قتل ہو گئے یقیناً مختارؓ نے ان قاتلوں کو ان کے جرائم کی سزا دے کر سیّد سجادؑ کے زخمی دل پر ایک مرہم لگا دیا مگر آپ کا طرزِ عمل اتنا غیر متعلق اور محتاط رہا کہ حکومتِ وقت کی طرف سے کوئی ذمہ داری آپ پر ان اقدامات کی کبھی عائد نہ ہو سکی۔

آپ کی پوری زندگی کا دور آلِ محمدؐ اور ان کے شیعوں کے لیے پُر آشوب رہا۔ یزید

کے تھوڑے ہی زمانہ کے بعد حجاج ابن یوسف ثقفی کے ذریعہ حکومت کا چُن چُن کر آلِ رسولؐ کے دوستوں کو قتل کرنا حکومت کی طرف سے ہر ایک نقل و حرکت بلکہ گفتگو پر بھی خفیہ مجرموں کا مقرر ہونا اس صورت میں کہاں ممکن تھا کہ آپ ہدایتِ خلق کے فرائض کو آزادی کے ساتھ انجام دے سکتے مگر آپ کی خاموش سیرتِ زندگی ہی دنیا کے لیے بہترین مثال تھی اور اپنی اسی خاموش زندگی سے آپ دنیا کو رسول اللہؐ کی سیرت سے روشناس بنا رہے تھے۔

مشاغل زندگی

واقعۂ کربلا کے بعد ۳۴ برس امام زین العابدینؑ نے انتہائی ناگوار حالات میں بڑے صبر و ضبط اور استقلال سے گزارے اس تمام مدت میں آپ دنیا کے شور و شر سے علیحدہ صرف دو مشغلوں میں رات دن بسر کرتے تھے۔ ایک عبادتِ خدا دوسرے اپنے باپ پر گریہ۔ یہی آپ کی مجلسیں تھیں جو زندگی بھر جاری رہیں۔ آپ جتنا اپنے والد بزرگوار کے مصائب کو یاد کر کے روئے ہیں دنیا میں اتنا کسی نے گریہ نہیں کیا۔ ہر ہر وقت پر آپ کو حسینؑ کی مصیبت یاد آتی تھی۔ جب کھانا سامنے آتا تھا تب روتے تھے۔ جب پانی سامنے آتا تھا تب روتے تھے۔ حسینؑ کی بھوک و پیاس یاد آجاتی تھی تو اکثر اس شدت سے گریہ وزاری فرماتے تھے اور اتنی دیر تک رونے میں مصروف رہتے تھے کہ گھر کے دوسرے لوگ گھبرا جاتے تھے۔ اور انھیں آپ کی زندگی کے لیے خطرہ محسوس ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ آخر کب تک رو تیے گا تو فرمایا کہ یعقوبؑ نبی کے بارہ بیٹے تھے۔ ایک فرزند غائب ہو گیا تو وہ اس قدر روئے کہ آنکھیں جاتی رہیں۔ میرے سامنے تو اٹھارہ عزیز و اقارب جن کا مثل و نظیر دنیا کے پردہ پر نہ تھا قتل ہو گئے ہیں میں کیسے نہ روؤں۔

یوں تو یہ رونا بالکل فطری تاثرات کی تحریک سے تھا مگر اس کے ضمن میں نہایت پُر امن طریقہ سے حسینؑ کی مظلومیت اور شہادت کا تذکرہ زندہ رہا اور امام زین العابدینؑ

کے غیر معمولی گریہ کے چرچے کے ساتھ شہادتِ حسینؑ کے واقعات کا تذکرہ فطری طور پر سے لوگوں کی زبانوں پر آتا رہا جو دوسری صورت میں اس وقت حکومتِ وقت کے مصالح کے خلاف ہونے کی بنا پر ممنوع قرار پا جاتا۔

دوسری مرتبہ گرفتاری

اتنی پُر امن زندگی کے باوجود حکومتِ شام کو اپنے مقاصد میں حضرتؑ کی ذات سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوا اور عبدالملک ابن مروان نے اپنی حکومت کے زمانے میں آپ کو گرفتار کرا کے مدینہ سے شام کی طرف بلوایا۔ اور دو تین دن آپ دمشق میں قید رہے مگر خدا کی قدرت تھی اور آپ کی روحانیت کا اعجاز جس سے عبدالملک خود پشیمان ہوا اور مجبوراً حضرت زین العابدین علیہ السلام کو مدینہ واپس ہو جانے دیا۔

اخلاق و کمالات

(پیغمبر خداؐ کی مبارک نسل کی یہ خصوصیت تھی کہ بارہ افراد لگاتار ایک ہی طرح کے انسانی کمالات اور بہترین اخلاق و اوصاف کے حامل ہوتے رہے جن میں سے ہر ایک اپنے وقت میں نوعِ انسانی کے لیے بہترین نمونہ تھا چنانچہ اس سلسلہ کی چوتھی کڑی سیّد سجادؑ تھے جو اخلاق و اوصاف میں اپنے بزرگوں کی یادگار تھے۔ اگر ایک طرف صبر و برداشت کا جوہر وہ تھا جو کربلا کے آئینہ میں نظر آیا تو دوسری طرف حلم اور عفو کی صفت آپ کی انتہا درجہ پر تھی۔ آپ نے ان موقعوں پر اپنے خلاف سخت کلامی کرنے والوں سے جس طرح گفتگو فرمائی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کا حلم اس طرح نہ تھا جیسے کوئی کمزور نفس والا انسان ڈر کر اپنے کو مجبور سمجھ کر تحمل سے کام لے بلکہ آپ عفو اور درگزر کی فضیلت پر زور دیتے ہوئے اپنے عمل سے اس کی مثال پیش کرتے تھے۔ ایک شخص نے بڑی سخت کلامی کی اور بہت سے غلط الزامات آپ پر آپ کے منہ پر عائد کیے۔ حضرتؑ نے فرمایا، جو کچھ تم نے کہا اگر وہ صحیح ہے تو خدا مجھے معاف کرے اور اگر غلط ہے

تو خدا تمھیں معاف کر دے۔ اس بلند اخلاقی کے مظاہرے کا ایسا اثر پڑا کہ مخالف نے سر جھکا دیا اور کہا حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ میں نے کہا وہ غلط ہی تھا۔ ایسے ہی دوسرے موقع پر ایک شخص نے آپ کی شان میں بہت ہی نازیبا کوئی لفظ استعمال کیا۔ حضرت نے اس طرح بے توجہی فرمائی کہ جیسے سنا ہی نہیں۔ اس نے پکار کے کہا اِیَاكَ اَعْنِیْ یعنی میں آپ کو کہہ رہا ہوں۔ حضرت نے فرمایا عَنْكَ اُعْرِضُ ہاں میں تم ہی سے اعراض یعنی بے توجہی کر رہا ہوں۔ یہ اشارہ تھا اس حکم قرآن کی طرف کہ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِیْنَ یعنی عفو کو اختیار کرو اچھے کاموں کی ہدایت کرو اور جاہلوں سے بے توجہی اختیار کرو۔

ھشام ابن اسماعیل ایک شخص تھا جس سے حضرتؑ کی نسبت کچھ ناگوار باتیں سرزد ہوئی تھیں یہ خبر بنی امیہ کے (نیک) بادشاہ عمر ابن عبدالعزیزؒ کو پہنچی۔ اس نے حضرت کو لکھا کہ میں اس شخص کو سزا دوں گا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے اس کو کوئی نقصان پہنچے۔

فیاضی اور خدمتِ خلق کا جذبہ آپ کا ایسا تھا کہ راتوں کو غلہ اور روٹیاں اپنی پشت پر رکھ کر غریبوں کے گھروں پر لے جاتے تھے اور تقسیم کرتے تھے۔ بہت سے لوگوں کو خبر بھی نہ ہوتی تھی کہ وہ کہاں سے پاتے ہیں اور کون ان تک پہنچاتا ہے۔ جب حضرتؑ کی وفات ہوئی اس وقت انھیں پتہ چلا کہ یہ امام زین العابدینؑ تھے۔ عمل کی ان خوبیوں کے ساتھ علمی کمال بھی آپ کا ایسا تھا جو دشمنوں کو بھی سر جھکانے پر مجبور کرتا تھا اور ان کو اقرار تھا کہ آپ کے زمانے میں فقہ اور علمِ دین کا کوئی عالم آپ سے بڑھ کر نہیں۔ ان تمام ذاتی بلندیوں کے ساتھ آپ دنیا کو یہ سبق بھی دیتے تھے کہ بلند خاندان سے ہونے پر ناز نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ آپ جب کبھی مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تھے تو اپنا نام و نسب لوگوں کو نہ بتلاتے تھے۔ کسی نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا، مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں اپنے نسب کا سلسلہ تو پیغمبرِ خداؐ تک ملاؤں اور ان کے صفات مجھ میں نہ پائے جائیں۔

عبادت

(آپ کی مخصوص صفت جس سے آپ زین العابدینؑ اور سید الساجدینؑ مشہور ہوئے وہ عبادت ہے) باوجود یہ کہ آپ کربلا کے ایسے بڑے حادثے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ باپ بھائیوں اور عزیزوں کے دردناک قتل کے مناظر برابر آپ کی آنکھوں میں پھرا کرتے تھے اس حالت میں کسی دوسرے خیال کا ذہن پر غالب آنا عام انسانی فطرت کے لحاظ سے بہت مشکل ہے مگر باپ کے اس غم و صدمہ پر جس نے عمر بھر سیدِ سجادؑ کو رلایا اگر کوئی چیز غالب آئی تو وہ خوفِ خدا اور عبادت میں محویت تھی۔ یہاں تک کہ جس وقت آپ کے تصورات کی دنیا بدل جاتی تھی، چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا اور جسم میں لرزہ پڑ جاتا تھا کوئی سبب پوچھتا تو فرماتے تھے کہ خیال تو کرو، مجھے کس حقیقی سلطان کی خدمت میں حاضر ہونا ہے۔

ایک مرتبہ حج کے موقع پر ایسا ہوا کہ احرام باندھتے وقت لَبَّیْکَ (حاضر ہوں) کہنا چاہا تو چہرہ کا رنگ اڑ گیا اور تمام جسم میں لرزہ پڑ گیا اور کسی طرح لَبَّیْکَ نہ کہا گیا۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا: میں سوچتا ہوں کہ شاید میں لَبَّیْکَ کہوں اور اس بارگاہ سے یہ آواز آئے کہ لَا لَبَّیْکَ (حاضری کی اجازت نہیں) یہ فرما کر اتنا روئے کہ غش آگیا۔ اس دور میں کہ جب دنیا کے دل پر دنیوی بادشاہوں کی عظمت کا اثر تھا اور خالق کو بالکل بھول چکی تھی۔ سید سجادؑ ہی تھے جن کی زندگی خالق کی عظمت کا احساس پیدا کرتی تھی۔

صحیفۂ سجّادیہ یا زبورِ آلِ محمدؐ

حضرت امام زین العابدینؑ کو زمانہ اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ وہ اپنے دادا علیؑ ابن ابی طالب کی طرح خطبوں (تقریروں) کے ذریعہ سے دنیا کو علوم و معارف اور الہیات وغیرہ کی تعلیم دیں۔ نہ ان کے لیے اس کا موقع تھا کہ وہ اپنے بیٹے امام محمد باقرؑ یا اپنے پوتے امام جعفر صادقؑ کی طرح شاگردوں کے مجمع میں علمی و دینی مسائل حل کریں

اور دنیا کو اچھی باتوں کی تعلیم دیں۔ یہ سب باتیں وہ تھیں جو اس وقت کی فضا کے لحاظ سے غیر ممکن تھیں۔

اس لیے امام زین العابدینؑ نے ایک تیسرا طریقہ اختیار کیا جو بالکل پُرامن تھا اور جسے رد کرنے کا دنیا کی کسی طاقت کو کوئی بہانہ نہیں مل سکتا تھا وہ یہ تھا کہ تمام دنیا والوں سے منہ موڑ کر وہ اپنے خالق سے مناجات کرتے اور دعائیں پڑھتے تھے۔ مگر یہ مناجاتیں اور دعائیں کیا تھیں؟ الٰہیات کا خزانہ، معارف و حقائق کا گنجینہ خالق اور مخلوق کے باہمی تعلق کا صحیح آئینہ ان دعاؤں کا مجموعہ صحیفہ کاملہ صحیفہ سجادیہ اور زبورِ آلِ محمدؐ کے ناموں سے اس وقت تک موجود ہے۔

اس میں انسان کو وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو اسے بڑے بڑے خطبوں اور تقریروں میں شاید اتنے پُرتاثیر انداز سے نہ ملتا۔

وفات

افسوس ہے کہ حضرت امام زین العابدینؑ کی یہ خاموش زندگی بھی ظالم حکومت کو ناگوار ہوئی اور ولید بن عبدالملک اموی بادشاہِ شام نے آپ کو زہر دلوا دیا اور ۲۵ محرم ۹۵ھ شہر مدینہ میں وفات ہوئی۔

امام محمد باقرؑ نے اپنے مقدس باپ کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا اور جنت البقیع میں حضرت امام حسنؑ کے پہلو میں دفن کیا۔

---

maablib.org

پانچویں امام

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام

نام و نسب

آپ کا نام اپنے جدِ بزرگوار حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے نام پر محمدؑ تھا اور باقر لقب۔ اسی وجہ سے امام محمد باقرؑ کے نام سے مشہور ہوئے۔ بارہ اماموں میں سے یہ آپ ہی کی خصوصیت تھی کہ آپ کا سلسلہ نسب ماں اور باپ دونوں طرف حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ دادا آپ کے سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام تھے جو حضرت رسولِ خدا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چھوٹے نواسے تھے اور والدہ آپ کی ام عبداللہ فاطمہؑ حضرت امام حسن علیہ السلام کی صاحبزادی تھیں جو حضرت رسولؐ کے بڑے نواسے تھے۔ اس طرح حضرت امام محمد باقر علیہ السلام رسولؐ کے بلند کمالات اور علیؑ و فاطمہؑ کی نسل کے پاک خصوصیات کے باپ اور ماں دونوں کی جانب سے وارث ہوئے۔

ولادت

maablib.org

آپ کی ولادت روز جمعہ یکم رجب ۵۷ھ میں ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب امام حسن علیہ السلام کی وفات کو سات برس ہو چکے تھے۔ امام حسین علیہ السلام مدینہ میں خاموشی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور وقت کی رفتار تیزی سے واقعہ کربلا کے اسباب فراہم کر رہی تھی۔ زمانہ آلِ رسولؐ اور شیعیانِ اہلبیتؑ کے لیے پُرآشوب تھا۔ چُن چُن کر محبانِ علیؑ گرفتار کیے جا رہے تھے تلوار کے گھاٹ اتارے جا رہے تھے

یا سُولیوں پر چڑھائے جا رہے تھے اس وقت اس مولود کی ولادت گویا کربلا کے جہاد میں شریک ہونے والے سلسلہ میں ایک کڑی کی تکمیل تھی۔

واقعہ کربلا

تین برس امام محمد باقر علیہ السلام اپنے جد بزرگوار حضرت امام حسینؑ کے سایہ میں رہے۔ جب آپ کا سن پورے تین برس کا ہوا تو امام حسینؑ نے مدینہ سے سفر کیا۔ اس کم سنی میں امام محمد باقرؑ بھی راستے کی تکلیفیں سہنے میں اپنے بزرگوں کے شریک رہے۔ امام حسین علیہ السلام نے مکہ میں پناہ لی۔ پھر کوفہ کا سفر اختیار کیا اور پھر کربلا پہنچے۔ ساتویں محرم سے جب پانی بند ہو گیا تو یقیناً امام محمد باقرؑ نے بھی تین یوم پیاس کی تکلیف برداشت کی۔ یہ خالق کے منشاء کی ایک تکمیل تھی کہ وہ روز عاشورہ میدانِ قربانی میں نہیں لائے گئے۔ ورنہ جب ان سے چھوٹے سن کا بچہ علی اصغرؑ تیرِ ستم کا نشانہ ہو سکتا تھا تو امام محمد باقرؑ کا بھی قربان گاہِ شہادت پر لانا ممکن تھا۔ مگر سلسلہ امامت کا دنیا میں قائم رہنا نظامِ کائنات کے برقرار رہنے کے لیے ضروری اور اہم تھا لہٰذا منظورِ الٰہی یہ تھا کہ امام محمد باقرؑ کربلا کے میدان میں اس طرح شریک ہوں جس طرح ان کے والد بزرگوار سید سجاد زین العابدین علیہ السلام شریک ہوئے۔ عاشورہ کو دن بھر عزیزوں کے لاشے پر لاشے آتے دیکھنا، بی بیوں میں کہرام، بچوں میں تہلکہ، امام حسینؑ کا وداع ہونا اور ننھی سی جان علی اصغرؑ تک کا جھولے سے جدا ہو کر میدان میں جانا اور پھر واپس نہ آنا، امامؑ کے باوفا گھوڑے کا در خیمہ پر خالی زین کے ساتھ آنا اور پھر خیمۂ عصمت میں ایک قیامت کا برپا ہونا، یہ سب مناظر امام محمد باقرؑ کی آنکھوں کے سامنے آئے اور پھر بعد عصر خیموں میں آگ کا لگنا، اسباب کا لوٹا جانا، بی بیوں کے سروں سے چادروں کا اتارا جانا اور آگ کے شعلوں سے بچوں کا گھبرا کر سراسیمہ و مضطرب اِدھر اُدھر پھرنا، اس عالم میں امام محمد باقرؑ کے ننھے سے دل پر کیا گزری اور کیا تاثرات ان کے دل پر قائم رہ گئے اس کا اندازہ کوئی دوسرا انسان نہیں کر سکتا۔

گیارہ محرم کے بعد ماں اور پھوپھی، دادی اور نانی تمام خاندان کے بزرگوں کو دشمنوں کی قید میں اسیر دیکھا۔ یقیناً اگر سکینہؑ کا بازو رسی میں بندھ سکتا تھا تو یقین کیا جا سکتا ہے کہ امام محمد باقرؑ کا گلا بھی ریسمانِ ظلم سے ضرور باندھا گیا۔ کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام اور پھر رہائی کے بعد مدینہ کی واپسی ان تمام منازل میں نہ جانے کتنے صدمے تھے جو امام محمد باقرؑ کے ننھے سے دل کو اٹھانا پڑے اور کتنے غم و الم کے نقش تھے جو دل پر ایسے بیٹھے کہ آیندہ زندگی میں ہمیشہ برقرار رہے۔

تربیت

واقعہ کربلا کے بعد امام زین العابدین علیہ السلام کی زندگی دنیا کی کشمکشوں اور آویزشوں سے بالکل الگ نہایت سکون اور سکوت کی زندگی تھی، اہلِ دنیا سے میل جول بالکل ترک کبھی محرابِ عبادت اور کبھی باپ کا ماتم ان ہی دو مشغلوں میں تمام اوقات صرف ہوتے تھے۔ یہ ہی زمانہ وہ تھا جس میں امام محمد باقرؑ نے نشوونما پائی۔ ۶۱ھ سے ۹۵ھ تک ۳۴ برس اپنے مقدس باپ کی سیرتِ زندگی کا مطالعہ کرتے رہے اور اپنے فطری اور خداداد ذاتی کمالات کے ساتھ ان تعلیمات سے فائدہ اٹھاتے رہے جو انھیں اپنے والدِ بزرگوار کی زندگی کے آئینہ میں برابر نظر آتی رہیں۔

باپ کی وفات اور امامت کی ذمہ داریاں

حضرت امام محمد باقرؑ بھرپور جوانی کی منزلوں کو طے کرتے ہوتے ایک ساتھ جسمانی و روحانی کمال کے بلند ترین نقطہ پر تھے اور ۳۸ برس کی عمر تھی جب آپ کے والد بزرگوار حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی وفات ہوئی۔ حضرت نے اپنے وقتِ وفات ایک صندوق جس میں اہلبیتؑ کے مخصوص علوم کی کتابیں تھیں امام محمد باقرؑ کے سپرد کیا نیز اپنی تمام اولاد کو جمع کر کے ان سب کی کفالت و تربیت کی ذمہ داری اپنے فرزند امام محمد باقرؑ پر قرار دی اور ضروری وصایا فرمائے اس کے بعد امامت کی ذمہ داریاں

حضرت امام محمد باقرؑ پر آئیں۔ آپ سلسلہ اہلبیتؑ کے پانچویں امام ہوئے ہیں جو رسولؐ خدا کے برحق جانشین تھے۔

اس دور کی خصوصیات

یہ وہ زمانہ تھا جب بنی امیہ کی سلطنت اپنی مادی طاقت کے لحاظ سے بڑھاپے کی منزلوں سے گزر رہی تھی۔ بنی ہاشم پر ظلم وستم اور خصوصاً کربلا کے واقعہ نے بہت حد تک دنیا کی آنکھوں کو کھول دیا تھا اور جب یزید خود اپنے مختصر زمانۂ حیات ہی میں جو واقعۂ کربلا کے بعد ہوا اپنے کیے پر پشیمان ہو چکا تھا اور اس کے برے نتائج کو محسوس کر چکا تھا اور اس کے بعد اس کا بیٹا معاویہ اپنے باپ اور دادا کے افعال سے کھلم کھلا اظہارِ بیزاری کر کے سلطنت سے دستبردار ہو گیا تھا تو بعد کے سلاطین کو کہاں تک ان مظالم کے مہلک نتائج کا احساس نہ ہوتا۔ جب کہ اس وقت جماعتِ توابین کا جہاد، مختارؒ اور ان کے ہمراہیوں کے خونِ حسینؑ کا بدلہ لینے میں اقدامات اور نہ جانے کتنے واقعات سامنے آ چکے تھے جن سے سلطنتِ شام کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ اس کا نتیجہ تھا کہ امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانۂ امامت کو حکومت کے ظلم و تشدد کی گرفت سے کچھ آزادی نصیب ہوئی اور آپ کو خلقِ خدا کی اصلاح وہدایت کا کچھ زیادہ موقع مل سکا۔

عزائے امام حسینؑ میں انہماک

آپ واقعۂ کربلا کو اپنی آنکھ سے دیکھے ہوئے تھے۔ پھر اپنے باپ کی تمام زندگی کا جو امام مظلومؑ کے غم میں رونے میں بسر ہوئی۔ مطالعہ کر چکے تھے۔ یہ احساس بھی نہایت تکلیف دہ تھا کہ ان کے والد بزرگوار باوجود اتنے غم ورنج اور گریہ وزاری کے ایسا موقع نہ پا سکے کہ دوسروں کو امام حسینؑ کے ماتم برپا کرنے کی دعوت دیتے اس کا نتیجہ تھا کہ امام محمد باقر علیہ السلام کو اس میں خاص اہتمام پیدا ہوا۔ آپ مجالس کی بنا فرماتے

تھے اور کمیت بن زید اسدی جو آپ کے زمانہ کے بڑے شاعر تھے۔ ان کو بلا کر مراثیٔ امام حسین علیہ السلام پڑھواتے اور سنتے تھے۔ یہی وہ ابتدا تھی جسے امام جعفر صادق علیہ السلام اور اس کے بعد پھر امام رضا علیہ السلام کے زمانہ میں بہت فروغ حاصل ہوا۔

علمی مرجعیّت

دریا کا پانی بند کے باندھ دیئے جانے سے جب کچھ عرصہ کے لیے ٹھہر جائے اور پھر کسی وجہ سے وہ بند ٹوٹے تو پانی بڑی قوت اور جوش وخروش کے ساتھ بہتا ہوا محسوس ہوگا۔ ائمہ اہل بیتؑ میں سے ہر ایک کے سینہ میں ایک ہی دریا تھا علم کا جو موجزن تھا مگر اکثر اوقات ظلم وتشدد کی وجہ سے اس دریا کو پیاسوں کے سیراب کرنے کے لئے بہنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ امام محمد باقرؑ کے زمانہ میں جب تشدد کا شکنجہ ذرا ڈھیلا ہوا تو علوم اہلبیتؑ کا دریا پوری طاقت کے ساتھ امنڈا اور ہزاروں پیاسوں کو سیراب کرتا ہوا" شریعت حقہ" اور احکامِ الٰہی کے کھیتوں کو سرسبز بناتا ہوا دنیا میں پھیل گیا۔ اس علمی تبحر اور وسعتِ معلومات کے مظاہرے کے نتیجے میں آپ کا لقب باقرؑ مشہور ہوا۔ اس لفظ کے معنی ہیں اندرونی باتوں کا ظاہر کرنے والا چونکہ آپ نے اپنے سے بہت سے پوشیدہ مطالب کو ظاہر کیا اس لیے تمام مسلمان آپ کو باقرؑ کے نام سے یاد کرنے لگے۔ آپ سے علوم اہلبیتؑ حاصل کرنے والوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ بہت سے ایسے افراد بھی جو عقیدتاً ائمہ معصومینؑ سے وابستہ نہ تھے اور جنھیں جماعت اہلسنت اپنے محدثین میں بلند درجہ پر سمجھتی ہے وہ بھی علمی فیوض حاصل کرنے امام محمد باقر علیہ السلام کی ڈیوڑھی پر آتے تھے جیسے زہری امام اوزاعی اور عطار بن جریح، قاضی حفض بن غیاث وغیرہ یہ سب امام محمد باقر علیہ السلام کے شاگردوں میں محسوب ہیں۔

علوم اہل بیتؑ کی اشاعت

حضرتؑ کے زمانہ میں علوم اہلبیتؑ کے تحفظ کا اہتمام ہوا اور حضرتؑ کے شاگردوں

نے ان افادات سے جو انھیں حضرت امام محمد باقرؑ سے حاصل ہوئے۔ مختلف علوم و فنون اور مذہب کے شعبوں میں کتابیں تصنیف کیں ذیل میں حضرت کے کچھ شاگردوں کا ذکر ہے اور ان کی تصانیف کا نام درج کیا جاتا ہے۔ جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ امام محمد باقر علیہ السلام سے اسلامی دنیا میں علم و مذہب نے کتنی ترقی کی۔

۱۔ ابان ابن تغلب: یہ علمِ قرأت اور لغت کے امام مانے گئے ہیں۔ سب سے پہلے کتاب غریب القرآن یعنی قرآن مجید کے مشکل الفاظ کی تشریح انھوں نے تحریر کی تھی اور ۱۴۱ھ میں وفات پائی۔

۲۔ ابوجعفر محمد ابنِ حسن ابن ابی سارہ رواسی۔ علم قرأت، نحو اور تفسیر کے مشہور عالم تھے۔ کتاب الفیصل معانی القرآن وغیرہ پانچ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ۱۰۱ھ میں وفات پائی۔

۳۔ عبداللہ ابن میمون اسود القداح: ان کی تصانیف سے ایک کتاب مبعث نبی، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اور تاریخ زندگی میں اور ایک کتاب حالاتِ جنت و نار میں تھی۔ ۱۰۵ھ میں وفات پائی۔

۴۔ عطیہ ابن سعید عوفی۔ پانچ جلدوں میں تفسیر قرآن لکھی۔ ۱۱۱ھ میں وفات پائی۔

۵۔ اسماعیل ابن عبدالرحمٰن السدی الکبیر۔ یہ مشہور مفسر قرآن ہیں۔ جن کے حوالے تمام اسلامی مفسرین نے سدی کے نام سے دیئے ہیں ۱۲۷ھ میں وفات پائی۔

۶۔ جابر بن یزید جعفی: انھوں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے پچاس ہزار حدیثیں سن کر یاد کیں اور ایک روایت میں ستر ہزار کی تعداد بتائی گئی ہے۔ اس کا ذکر صحاح ستہ میں سے صحیح مسلم میں موجود ہے۔ تفسیر، فقہ اور حدیث میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ۱۲۸ھ میں وفات پائی۔

۷۔ عمار بن معاویہ وہنی: فقہ میں ایک کتاب تصنیف کی ۱۳۳ھ میں وفات پائی۔

۸۔ سالم بن ابی حفصہ ابو یونس کوفی: فقہ میں ایک کتاب لکھی وفات ۱۳۷ھ میں پائی۔

۹۔ عبدالمومن ابن قاسم ابو عبداللہ انصاری: یہ بھی فقہ میں ایک کتاب کے مصنف ہیں۔

۱۴۷ھ میں وفات پائی۔

۱۰۔ ابوحمزہ ثمالی، تفسیر قرآن میں ایک کتاب لکھی اس کے علاوہ کتاب النوادر اور کتاب الزہد بھی ان کی تصانیف میں سے ہیں۔ ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔

۱۱۔ زرارہ ابن اعین: بڑے بزرگ مرتبہ شیعہ عالم تھے ان کی علم کلام اور فقہ اور حدیث میں بہت سی کتابیں ہیں۔ وفات ۱۵۰ھ

۱۲۔ محمد بن مسلم: یہ بھی بڑے بلند پایہ بزرگ تھے۔ امام باقر علیہ السلام سے تیس ہزار حدیثیں سنیں۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے ایک کتاب تھی۔ چہار صد مسئلہ در ابواب حلال و حرام۔ وفات ۱۵۰ھ

۱۳۔ یحیٰی بن قاسم ابوبصیر اسدی جلیل المرتبہ بزرگ تھے، کتاب مناسک حج کتاب یوم ولیلہ تصنیف کی۔ ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔

۱۴۔ اسحٰق قمی، فقہ میں ایک کتاب کے مصنف ہیں۔

۱۵۔ اسماعیل بن جابر خثعمی کوفی: احادیث کی کئی کتابیں تصنیف کیں اور ایک کتاب فقہ میں تصنیف کی۔

۱۶۔ اسمٰعیل بن عبدالخالق: بلند مرتبہ فقیہہ تھے۔ ان کی تصنیف سے بھی ایک کتاب تھی۔

۱۷۔ بردالاسکاف الازدی: فقہ میں ایک کتاب لکھی۔

۱۸۔ حارث بن مغیرہ: یہ بھی مسائل فقہ میں ایک کتاب کے مصنف ہیں۔

۱۹۔ حذیفہ بن منصور خزاعی: ان کی بھی ایک کتاب فقہ میں تھی۔

۲۰۔ حسن بن السری الکاتب: ایک کتاب تصنیف کی۔

۲۱۔ حسین بن ثور ابن ابی فاختہ: کتاب النوادر تحریر کی۔

۲۲۔ حسین بن حماد عبدی کوفی: ایک کتاب کے مصنف ہیں۔

۲۳۔ حسین بن مصعب بجلی: ان کی بھی ایک کتاب تھی۔

۲۴۔ حماد بن ابی طلحہ: ایک کتاب تحریر کی۔

۲۵۔ حمزہ بن حمران بن اعین: زرارہ کے بھتیجے تھے اور ایک کتاب کے مصنف تھے۔

maablib.org

یہ چند نام ہیں ان کثیر علمار و فقہا و محدثین میں سے جنہوں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے علوم اہلبیتؑ کو حاصل کر کے کتابوں کی صورت میں محفوظ کیا۔ یہ اور پھر اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور میں جو سینکڑوں کتابیں تصنیف ہوئیں یہی وہ سرمایہ تھا جس سے بعد میں کافی، من لایحضرہ، تہذیب، اور استبصار ایسے بڑے حدیث کے خزانے جمع ہو سکے جن پر شیعیت کا آسمان دورہ کرتا رہا ہے۔

اخلاق واوصاف

آپ کے اخلاق وہ تھے کہ دشمن بھی قائل تھے چنانچہ ایک شخص اہلِ شام میں سے مدینہ میں قیام رکھتا تھا اور اکثر امام محمد باقر علیہ السلام کے پاس آکر بیٹھا کرتا تھا۔ اس کا بیان تھا کہ مجھے اس گھرانے سے ہرگز کوئی خلوص و محبت نہیں مگر آپ کے اخلاق کی کشش اور فصاحت وہ ہے جس کی وجہ سے میں آپ کے پاس آنے اور بیٹھنے پر مجبور ہوں۔

امورِ سلطنت میں مشورہ

سلطنتِ اسلامیہ حقیقت میں ان اہلبیتؑ رسولؐ کا حق تھی مگر دنیا والوں نے مادی اقتدار کے آگے سر جھکایا اور ان حضرات کو گوشہ نشینی اختیار کرنا پڑی۔ عام افراد انسانی کی ذہنیت کے مطابق اس صورت میں اگرچہ حکومتِ وقت کسی وقت ان حضرات کی امداد کی ضرورت محسوس کرتی تو صاف طور پر انکار میں جواب دیا جا سکتا تھا مگر ان حضرات کے پیشِ نظر عالی ظرفی کا وہ معیار تھا جس تک عام لوگ پہنچے ہوئے نہیں ہوتے۔ جس طرح امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے سخت موقعوں پر حکومت وقت کو مشورے دینے سے گریز نہیں کیا اسی طرح اس سلسلہ کے تمام حضراتؑ نے اپنے اپنے زمانہ کے بادشاہوں کے ساتھ یہی طرزِ عمل اختیار کیا۔ چنانچہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانہ میں بھی ایسی صورت پیش آئی۔ واقعہ یہ تھا کہ حکومتِ اسلام کی طرف سے اس وقت تک کوئی خاص سکّہ نہیں بنایا گیا تھا بلکہ رومی سلطنت کے سکّے اسلامی

سلطنت میں بھی رائج تھے۔ ولید بن عبد الملک کے زمانہ میں سلطنت شام اور سلطان روم کے درمیان اختلافات پیدا ہو گیا۔ رومی سلطنت نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ اپنے سکوں پر پیغمبر اسلامؐ کی شان کے خلاف کچھ الفاظ درج کرا دے گی اس پر مسلمانوں میں بڑی بے چینی پیدا ہو گئی۔ ولید نے ایک بہت بڑا جلسہ مشاورت کے لیے منعقد کیا جس میں عالم اسلام کے ممتاز افراد شریک تھے۔ اس جلسہ میں امام محمد باقر علیہ السلام بھی شریک ہوئے اور آپ نے یہ رائے دی کہ مسلمانوں کو خود اپنا سکہ ڈھالنا چاہتے جس میں ایک طرف لا اللہ الا اللہ اور دوسری طرف محمدٌ رسول اللہ نقش ہو۔ امامؑ کی اس تجویز کے سامنے سر تسلیم خم کیا گیا اور اسلامی سکہ اس طور پر تیار کیا گیا۔

سلطنت بنی امیہ کی طرف سے مزاحمت

باوجودیکہ امام محمد باقرؑ معاملاتِ ملکی میں کوئی دخل نہ دیتے تھے اور دخل دیا بھی تو سلطنت کی خواہش پر وقارِ اسلامی کے برقرار رکھنے کے لیے۔ مگر آپ کی خاموش زندگی اور خالص علمی اور روحانی مرجعیت بھی سلطنت وقت کو گوارا نہ تھی چنانچہ ہشام ابن عبد الملک نے مدینہ کے حاکم کو خط لکھا کہ امام باقر علیہ السلام کو ان کے فرزند حضرت جعفر صادقؑ کے ہمراہ دمشق بھیج دیا جائے۔ اس کو منظور یہ تھا کہ حضرتؑ کی عزت و وقار کو اپنے خیال میں دھچکا پہنچائے۔ چنانچہ جب یہ حضراتؑ دمشق پہنچے تو تین دن تک ہشام نے ملاقات کا موقع نہیں دیا۔ چوتھے دن دربار میں بلا بھیجا۔ ایک ایسے موقع پر کہ جب وہ تخت شاہی پر بیٹھا تھا اور لشکر داہنے اور بائیں ہتھیار لگائے صف بستہ کھڑا تھا اور وسطِ دربار میں ایک نشانہ تیر اندازی کا مقرر کیا گیا تھا اور روسائے سلطنت اس کے سامنے شرط باندھ کر تیر لگاتے تھے امام علیہ السلام کے پہنچنے پر انتہائی جرأت اور جسارت کے ساتھ اس نے خواہش کی کہ آپ بھی ان لوگوں کے ہمراہ تیر کا نشانہ لگائیں۔ ہر چند حضرتؑ نے معذرت فرمائی مگر اس نے قبول نہ کیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ آلِ محمدؐ طویل مدت سے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کو جنگ کے فنون سے کیا واسطہ؟ اور اس طرح

منظور یہ تھا کہ لوگوں کو ہنسنے کا موقع ملے۔ مگر وہ یہ نہ جانتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک فرد کے بازو میں علیؑ کی قوت اور دل میں امام حسین علیہ السلام کی طاقت موجود ہے۔ وہ حکمِ الٰہی اور فرض کا احساس ہے جس کی وجہ سے یہ حضرات ایک سکون اور سکوت کا مجسمہ نظر آتے ہیں۔ یہی ہوا کہ جب مجبور ہو کر حضرت نے تیر و کمان ہاتھ میں لیا اور چند تیر پے در پے ایک ہی نشانے پر بالکل ایک ہی نقطہ پر لگائے تو مجمع تعجب اور حیرت میں غرق ہو گیا اور ہر طرف سے تعریفیں ہونے لگیں۔ ہشام کو اپنے طرزِ عمل پر پشیمان ہونا پڑا۔ اس کے بعد اس کو یہ احساس ہوا کہ امام علیہ السلام کا دمشق میں قیام کہیں عام خلقت کے دل میں اہلبیتؑ کی عظمت قائم کر دینے کا سبب نہ ہو۔ اس لیے اس نے آپ کو واپس مدینہ جانے کی اجازت دے دی مگر دل میں حضرتؑ کے ساتھ عداوت میں اور اضافہ ہو گیا۔

وفات

سلطنتِ شام کو جتنا حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی جلالت اور بزرگی کا اندازہ زیادہ ہوتا گیا اتنا ہی آپ کا وجود ان کے لیے ناقابلِ برداشت محسوس ہوتا رہا۔ آخر آپ کو اس خاموش زہر کے حربے سے جو اکثر سلطنتِ بنی امیہ کی طرف سے کام میں لایا جاتا رہا تھا شہید کرنے کی تدبیر کر لی گئی۔ وہ ایک زین کا تحفہ تھا جس میں خاص تدبیروں سے زہر پوشیدہ کیا گیا تھا اور جب حضرت اس زین پر سوار ہوئے تو زہر جسم میں سرایت کر گیا۔ چند روز کرب و تکلیف میں بسترِ بیماری پر گزرے اور آخر سات ذی الحجہ ۱۱۴ھ کو ۵۷ برس کی عمر میں وفات پائی۔

آپ کو حسبِ وصیت تین کپڑوں کا کفن دیا گیا جن میں سے ایک وہ یمنی چادر تھی جسے اوڑھ کر آپ روزِ جمعہ نماز پڑھتے تھے اور ایک وہ پیراہن تھا جسے آپ ہمیشہ پہنے رہتے تھے اور جنت البقیع میں اسی قبہ میں کہ جہاں حضرت امام حسنؑ اور امام زین العابدینؑ دفن ہو چکے تھے حضرتؑ بھی دفن کیے گئے۔

چھٹے امام

حضرت امام جعفر صادق آلِ محمد علیہ السلام

نام و نسب

جعفرؑ نام رکنیت ابو عبدؑ اللہ اور صادقؑ لقب تھا۔ آپ امام محمدؑ باقر کے بیٹے حضرت امام زین العابدینؑ کے پوتے اور شہیدِ کربلا حضرت امام حسین علیہ السلام کے پرپوتے تھے۔ سلسلہ عصمت کی آٹھویں کڑی اور آئمہ اہلبیتؑ میں سے چھٹے امام تھے۔ آپ کی والدہ حضرت محمد ابن ابی بکرؓ کی پوتی ام فردہ تھیں جن کے والد قاسم ابن محمدؓ مدینہ کے سات مشہور فقہا میں سے تھے۔

ولادت

۸۳ھ میں ۱۷ ربیع الاول کو اپنے جدِ بزرگوار رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ولادت کی تاریخ کو آپ کی ولادت ہوئی۔ اس وقت آپ کے دادا حضرت امام زین العابدینؑ بھی زندہ تھے۔ آپ کے والد بزرگوار حضرت امام محمدؑ باقر کی عمر اس وقت چھبیس برس کی تھی۔ خاندانِ آلِ محمدؐ میں اس اضافہ کا انتہائی خوشی سے استقبال کیا گیا۔

نشوونما اور تربیت

بارہ برس آپ نے اپنے جدِ بزرگوار حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے زیرِ سایہ تربیت پائی۔ شہادت امام حسین علیہ السلام کے بعد سے پینتیس برس امام زین العابدینؑ

maablib.org

کا مشغلہ عبادتِ الٰہی اور اپنے مظلوم باپ حضرت سید الشہداءؑ کو رونے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ واقعۂ کربلا کو ابھی صرف بائیس برس گزرے تھے۔ اس مدت میں کربلا کا عظیم الشان واقعہ اپنے اثرات کے لحاظ سے ابھی کل ہی کی بات معلوم ہوتا تھا امام جعفر صادقؑ نے آنکھ کھولی تو اسی غم واندوہ کی فضا میں شب و روز شہادتِ حسین علیہ السلام کا تذکرہ اور اس غم میں نوحہ و ماتم اور گریہ و بکا کی آوازوں نے ان کے دل و دماغ پر وہ اثر قائم کیا کہ جیسے وہ خود واقعۂ کربلا میں موجود ہوتے۔ پھر جب وہ یہ سنتے تھے کہ ان کے والد بزرگوار امام محمد باقرؑ بھی کمسنی ہی کے دور میں سہی اس جہاد میں شریک تھے تو ان کے دل کو یہ احساس بہت صدمہ پہنچاتا ہوگا کہ خاندانِ عصمت کے موجودہ افراد میں ایک میں ہی ہوں جو اس قابلِ فخر یادگار معرکۂ ابتلا میں موجود نہ تھا۔ چنانچہ اس کے بعد ہمیشہ اور عمر بھر امام جعفر صادق علیہ السلام نے جس جس طرح اپنے جدِ مظلوم امام حسینؑ کی یاد کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے وہ اپنی آپ ہی مثال ہے۔

بارہ برس کی آپ کی عمر تھی جب ۹۵ھ میں امام زین العابدین علیہ السلام کا سایہ سر سے اٹھا۔ اس کے بعد انیس برس آپ نے اپنے والدِ ماجد حضرت امام محمد باقرؑ علیہ السلام کے دامانِ تربیت میں گزارے۔ یہ وہ وقت تھا جب سیاستِ بنی امیہ کی بنیادیں ہل چکی تھیں اور امام محمد باقرؑ کی طرف فیوضِ علمی حاصل کرنے کے لیے خلائق رجوع کر رہی تھی۔ اس وقت اپنے پدرِ بزرگوار کی مجلسِ درس میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ہی ایک وہ طالب علم تھے جو قدرت کی طرف سے علم کے سانچے میں ڈھال کر پیدا کیے گئے تھے۔ آپ سفر اور حضر دونوں میں اپنے والد بزرگوار کے ساتھ رہتے تھے چنانچہ ہشام ابن عبد الملک کی طلب پر حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے ساتھ تھے اس کا ذکر پانچویں امام کے حالات میں ہو چکا ہے۔

دورِ امامت

۱۱۴ھ میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی وفات ہوئی۔ اب امامت کی ذمہ داریاں

امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف عائد ہوئیں۔ اس وقت دمشق میں ہشام بن عبدالملک کی سلطنت تھی۔ اس کے زمانہ سلطنت میں ملک میں سیاسی خلفشار بہت زیادہ ہو چکا تھا۔ مظالم بنی امیہ کے انتقام کا جذبہ تیز ہو رہا تھا اور بنی فاطمہ میں سے متعدد افراد حکومت کے مقابلے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ ان میں نمایاں ہستی حضرت زیدؒ کی تھی جو امام زین العابدین علیہ السلام کے بزرگ مرتبہ فرزند تھے۔ ان کی عبادت زہد و تقویٰ کا بھی ملک عرب میں شہرہ تھا۔ مستند اور مسلّم حافظِ قرآن تھے۔ بنی امیہ کے مظالم سے تنگ آ کر انھوں نے بھی میدانِ جہاد میں قدم رکھا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے لیے یہ موقع نہایت نازک تھا مظالم بنی امیہ سے نفرت میں ظاہر ہے کہ آپ زیدؓ کے ساتھ متفق تھے پھر جناب زیدؓ آپ کے چچا بھی تھے جن کا احترام آپ لازم سمجھ رہے تھے مگر آپ کی انجام بیں نگاہ دیکھ رہی تھی کہ یہ اقدام کسی مفید نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے عملی طور سے آپ ان کا ساتھ دینا مناسب نہ سمجھتے تھے مگر یہ واقعہ ہوتے ہوتے بھی خود ان کی ذات سے آپ کو انتہائی ہمدردی تھی۔ آپ نے مناسب طریقہ پر انھیں مصلحت بینی کی دعوت دی مگر اہل عراق کی ایک بڑی جماعت کے اقرارِ اطاعت و وفاداری نے جناب زیدؓ کو کامیابی کے توقعات پیدا کر دیئے اور آخر ۱۲۰ھ میں ظالم فوجِ شام سے تین روز تک بہادری کے ساتھ جنگ کرنے کے بعد شہید ہوئے۔ دشمن کا جذبۂ انتقام اتنے ہی پر ختم نہیں ہوا بلکہ دفن ہو چکنے کے بعد ان کی لاش کو قبر سے نکالا گیا اور سر کو جدا کر کے ہشام کے پاس بطورِ تحفہ بھیجا گیا اور لاش کو دروازۂ کوفہ پر سولی دے دی گئی اور کئی برس تک اسی طرح آویزاں رکھا گیا۔ جناب زیدؓ کے ایک سال کے بعد ان کے بیٹے یحیٰی ابن زیدؓ بھی شہید ہوئے۔ یقیناً ان حالات کا امام جعفر صادق علیہ السلام کے دل پر گہرا اثر پڑ رہا تھا۔ مگر وہ جذبات سے بلند فرائض کی پابندی تھی کہ اس کے باوجود آپ نے ان فرائض کو جو اشاعتِ علوم اہلبیتؑ اور نشرِ شریعت کے قدرت کی جانب سے آپ کے سپرد تھے برابر جاری رکھا۔

انقلابِ سلطنت

بنی امیہ کا آخری دور ہنگاموں اور سیاسی کشمکشوں کا مرکز بن گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بہت جلدی جلدی حکومتوں میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور اسی لیے امام جعفر صادق علیہ السلام کو بہت سی دنیوی سلطنتوں کے دور سے گزرنا پڑا۔ ہشام بن عبدالملک کے بعد ولید بن یزید بن عبدالملک پھر یزید بن ولید ابن عبدالملک اس کے بعد ابراہیم بن ولید ابن عبدالملک اور آخر میں مروان حمار جس پر بنی امیہ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

جب سلطنت کی داخلی کمزوریاں قہر و غلبہ کی چولیں ہلا چکی ہوں تو قدرتی بات ہے کہ وہ لوگ جو اس حکومت کے مظالم کا مدتوں نشانہ رہ چکے ہوں اور جنھیں ان کے حقوق سے محروم کر کے صرف تشدد کی طاقت سے پنپنے کا موقع نہ دیا گیا ہو، قفس کی تیلیوں کو کمزور پا کر پھڑپھڑانے کی کوشش کریں گے اور حکومت کے شکنجے کو ایک دم توڑ دینا چاہیں گے۔ سوائے ایسے بلند افراد کے جو جذبات کی پیروی سے بلند ہوں۔ عام طور پر اس طرح کی انتقامی کوششوں میں مصلحت اندیشی کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹنے کا امکان ہے مگر وہ انسانی فطرت کا ایک کمزور پہلو ہے جس سے خاص خاص افراد ہی مستثنیٰ ہو سکتے ہیں۔

بنی ہاشم میں عام طور پر سلطنت بنی امیہ کے اس آخری دور میں اسی لیے ایک حرکت اور غیر معمولی اضطراب پایا جا رہا تھا۔ اس اضطراب سے بنی عباس نے فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے آخری دورِ اموییت میں پوشیدہ طریقے سے ممالکِ اسلامیہ میں ایک ایسی جماعت بنائی جس نے قسم کھائی تھی کہ ہم سلطنت کو بنی امیہ سے لے کر بنی ہاشم تک پہنچائیں گے جن کا وہ واقعی حق ہے۔ حالانکہ حق تو ان میں سے مخصوص ہستیوں ہی میں منحصر تھا جو خدا کی طرف سے نوعِ انسانی کی رہبری اور سرداری کے حقدار قرار دیئے گئے تھے مگر یہ وہی جذبات سے بلند انسان تھے جو موقع کی سیاسی رفتار سے

ہنگامی فوائد حاصل کرنا اپنا نصب العین نہ رکھتے تھے۔ سلسلہ بنی ہاشم میں سے ان حضرات کی خاموشی قائم رہنے کے ساتھ اس ہمدردی کو جو عوام میں خاندان ہاشم کے ساتھ پائی جاتی تھی۔ بنی عباس نے اپنے لیے حصولِ سلطنت کا ذریعہ قرار دیا۔ حالانکہ انھوں نے سلطنت پانے کے ساتھ بنی ہاشم کے اصل حقداروں سے ویسا ہی یا اس سے زیادہ سخت سلوک کیا جو بنی امیہ ان کے ساتھ کر چکے تھے۔ یہ واقعات مختلف اماموں کے حالات میں آئندہ آپ کے سامنے آئیں گے۔

بنی عباس میں سے سب سے پہلے محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس نے بنی امیہ کے خلاف تحریک شروع کی اور ایران میں مبلغین بھیجے جو مخفی طریقہ پر لوگوں سے بنی ہاشم کی وفاداری کا عہد و پیمان حاصل کریں۔ محمد بن علی کے بعد ان کے بیٹے ابراہیم قائم مقام ہوئے۔ جناب زیدؑ اور ان کے صاحبزادے جناب یحییٰؒ کے دردناک واقعاتِ شہادت سے بنی امیہ کے خلاف غم و غصہ میں اضافہ ہو گیا۔ اس سے بھی بنی عباس نے فائدہ اٹھایا اور ابوسلمہ خلال کے ذریعہ سے عراق میں بھی اپنے اثرات قائم کرنے کا موقع ملا۔ رفتہ رفتہ اس جماعت کے حلقۂ اثر میں اضافہ ہوتا گیا اور ابومسلم خراسانی کی مدد سے عراق عجم کا پورا علاقہ قبضہ میں آگیا اور بنی امیہ کی طرف کے حاکم کو وہاں سے فرار اختیار کرنا پڑا۔ ۱۲۹ھ سے عراق عجم اور خراسان وغیرہ میں سلاطین بنی امیہ کے نام خطبہ سے خارج کر کے ابراہیم بن محمد کا نام داخل کر دیا گیا۔

ابھی تک سلطنت بنی امیہ یہ سمجھتی تھی کہ یہ حکومت سے ایک مقامی مخالفت ہے۔ جو ایران میں محدود ہے مگر اب جاسوسوں نے اطلاع دی کہ اس کا تعلق ابراہیم ابن محمد بن عباس کے ساتھ ہے جو مقام جابلقا میں رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ابراہیم کو قید کر دیا گیا اور قید خانہ ہی میں پھر ان کو قتل کرا دیا گیا۔ ان کے پس ماندگان دوسرے افراد بنی عباس کے ساتھ بھاگ کر عراق میں ابوسلمہ کے پاس چلے گئے۔ ابومسلم خراسانی کو جو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو ایک فوج کو عراق کی طرف روانہ کیا جس نے حکومتی طاقت کو شکست دے کر عراق کو آزاد کرا لیا۔

ابوسلمہ خلال جو وزیر آلِ محمدؐ کے نام سے مشہور ہیں بنی فاطمہ کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے۔ انھوں نے چند خطوط اولادِ رسولؐ میں سے چند بزرگوں کے نام لکھے اور ان کو قبولِ خلافت کی دعوت دی۔ ان میں سے ایک خط حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے نام بھی تھا۔ سیاست کی دنیا میں ایسے مواقع اپنے اقتدار کے قائم کرنے کے لیے غنیمت سمجھے جاتے ہیں مگر وہ انسانی خودداری و استغنا کا مثالی مجسمہ تھا جس نے اپنے فرائضِ منصبی کے لحاظ سے اس موقع کو ٹھکرا دیا اور بجائے جواب دینے کے حقارت آمیز طریقہ پر اس خط کو آگ کی نذر کر دیا۔

ادھر کوفہ میں ابومسلم خراسانی کے تابعین اور بنی عباس کے ہوا خواہوں نے عبداللہ سفاح کے ہاتھ پر ۱۴ / ربیع الثانی ۱۳۲ھ کو بیعت کر لی اور اس کو امت اسلامیہ کا خلیفہ اور فرمانروا تسلیم کر لیا۔ عراق میں اقتدار قائم کرنے کے بعد انھوں نے دمشق پر چڑھائی کر دی۔ مروان حمار نے بھی بڑے لشکر کے ساتھ مقابلہ کیا مگر بہت جلد اس کی فوج کو شکست ہوئی۔ مروان نے فرار کیا اور آخر افریقہ کی سرزمین پر پہنچ کر قتل ہوا۔ اس کے بعد سفاح نے بنی امیہ کا قتلِ عام کرایا۔ سلاطین بنی امیہ کی قبریں کھدوائیں اور ان کی لاشوں کے ساتھ عبرتناک سلوک کیے گئے۔ اس طرح قدرت کا انتقام جو ان ظالموں سے لیا جانا ضروری تھا بنی عباس کے ہاتھوں دنیا کی نگاہ کے سامنے آیا۔ ۱۳۶ھ میں ابوعبداللہ سفاح بنی عباس کے پہلے خلیفہ کا انتقال ہو گیا۔ جس کے بعد اس کا بھائی ابوجعفر منصور تخت خلافت پر بیٹھا جو منصور دوانقی کے نام سے مشہور ہے۔

سادات پر مظالم

یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ بنی عباس نے ان ہمدردیوں سے جو عوام کو بنی فاطمہؑ کے ساتھ تھیں ناجائز فائدہ اٹھایا تھا اور انھوں نے دنیا کو یہ دھوکا دیا تھا کہ ہم اہلبیتِ رسولؐ کے حقوق کی حفاظت کے لیے کھڑے ہوتے ہیں چنانچہ انھوں نے

رضائے آلِ محمدؐ ہی کے نام پر لوگوں کو اپنی نصرت و حمایت پر آمادہ کیا تھا اور اسی کو اپنا نعرۂ جنگ قرار دیا تھا۔ اس لیے انھیں بر سر اقتدار آنے کے بعد اور بنی امیہ کو تباہ کرنے کے بعد سب سے بڑا اندیشہ یہ تھا کہ کہیں ہمارا یہ فریب دنیا پر کھل نہ جائے اور تحریک پیدا نہ ہو جائے کہ خلافت بنی عباس کی بجائے بنی فاطمہؑ کے سپرد ہونا چاہیے۔ جو حقیقت میں آلِ رسولؐ ہیں۔ ابو سلمہ خلال بنی فاطمہؑ کے ہمدردوں میں سے تھے اس لیے یہ خطرہ تھا کہ وہ اس تحریک کی حمایت نہ کرے، لہٰذا سب سے پہلے ابو سلمہ کو راستے سے ہٹایا گیا اور وہ باوجود ان احسانات کے جو بنی عباس سے کر چکا تھا سفاح ہی کے زمانہ میں تشدد کا نشانہ بنا اور تلوار کے گھاٹ اتارا گیا۔ ایران میں ابو مسلم خراسانی کا اثر تھا۔ منصور نے انتہائی مکاری اور غداری کے ساتھ اس کی زندگی کا بھی خاتمہ کر دیا۔

اب اسے اپنی من مانی کارروائیوں میں کسی با اثر اور صاحبِ اقتدار شخصیت کی مزاحمت کا اندیشہ نہ تھا لہٰذا اس کے ظلم و ستم کا رخ سادات بنی فاطمہؑ کی طرف مڑ گیا۔ مولانا شبلی سیرت النعمان میں لکھتے ہیں "صرف بدگمانی پر منصور نے سادات علویین کی بیخ کنی شروع کر دی۔ جو لوگ ان میں ممتاز تھے ان کے ساتھ بے رحمیاں کی گئیں۔ محمد ابنِ ابراہیم کہ حسن و جمال میں یگانہ روزگار تھے اور اسی وجہ سے دیباج کہلاتے تھے زندہ دیواروں میں چنوا دیے گئے۔ ان بے رحمیوں کی ایک داستان ہے جس کے بیان کرنے کو بڑا سخت دل چاہیے"۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے دل پر ان حالات کا بہت اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ جب سادات بنی حسنؑ طوق و زنجیر میں قید کر کے مدینہ سے لے جائے جا رہے تھے تو حضرت ایک مکان کی آڑ میں کھڑے ہوئے ان کی حالت کو دیکھ دیکھ کر رو رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ افسوس مکہ و مدینہ بھی دار الامن نہ رہا۔ پھر آپ نے اولادِ انصار کی حالت پر افسوس کیا کہ انصار نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس عہد و پیمان پر مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی تھی کہ ہم آپ کی اور آپ کی اولاد کی

اس طرح حفاظت کریں کہ جس طرح اپنے اہل و عیال اور جان و مال کی حفاظت کرتے ہیں مگر آج انصار کی اولاد باقی ہے اور کوئی ان سادات کی امداد نہیں کرتا۔ یہ فرما کر آپ بیت الشرف کی طرف واپس ہوئے اور بیس دن تک شدت سے بیمار رہے۔

ان قیدیوں میں امام حسین علیہ السلام کے صاحبزادے عبداللہ محض بھی تھے جنھوں نے کبرسنی کے عالم میں عرصہ تک قید کی مصیبتیں اٹھائیں۔ ان کے بیٹے محمد نفسِ زکیہ نے حکومت کا مقابلہ کیا اور ۱۴۵ھ میں دشمن کے ہاتھ سے مدینہ منورہ کے قریب شہید ہوئے۔ جوان بیٹے کا سر بوڑھے باپ کے پاس قید خانہ میں بھیجا گیا اور یہ صدمہ ایسا تھا کہ جس سے عبداللہ محض پھر زندہ نہ رہ سکے اور ان کی روح نے جسم سے مفارقت کی۔ اس کے بعد عبداللہ کے دوسرے صاحبزادے ابراہیم بھی منصور کی فوج کے مقابلہ میں جنگ کرکے کوفہ میں شہید ہوئے۔ اسی طرح عباس ابنِ حسن، عمر ابنِ حسن مثنیٰ، علی و عبداللہ فرزندان نفس زکیہ، موسیٰ اور یحییٰ برادرانِ نفسِ زکیہ وغیرہ بھی بے دردی اور بے رحمی سے قتل کیے گئے۔ بہت سے سادات عمارتوں میں زندہ چنوا دیئے گئے۔

امام کے ساتھ بدسلوکیاں

ان تمام ناگوار حالات کے باوجود جن کا تذکرہ انتہائی اختصار کے ساتھ اوپر لکھا گیا ہے امام جعفر صادق علیہ السلام خاموشی کے ساتھ علوم اہلبیتؑ کی اشاعت میں مصروف رہے اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ لوگ بھی جو بحیثیت امامتِ حقہ آپ کی معرفت نہ رکھتے تھے یا اسے تسلیم کرنا نہیں چاہتے تھے وہ بھی آپ کی علمی عظمت کو مانتے ہوئے آپ کے حلقۂ درس میں داخل ہونے کو فخر سمجھتے تھے۔

منصور نے پہلے حضرت کی علمی عظمت کا اثر عوام کے دل سے کم کرنے کے لیے ایک تدبیر یہ کی کہ آپ کے مقابلے میں ایسے اشخاص کو بحیثیت فقیہہ اور عالم کے کھڑا کر دیا جو آپ کے شاگردوں کے سامنے بھی زبان کھولنے کی قدرت نہ رکھتے تھے اور پھر وہ خود اس

کا اقرار رکھتے تھے کہ ہمیں جو کچھ ملا وہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی بارگاہ سے حاصل ہوا مگر اقتدارِ حکومت ان کے فتوے کو مستند قرار نہ دیتا تھا اور اس طرح حضرت صادق آل محمدؑ کی مرجعیت کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اس میں ناکامی ہوتی تو حضرتؑ کی ایذا رسانی اور قتل یا گرفتاری کی تدبیریں کی جانے لگیں۔ اس کے لیے ہر ہر شہر ہر ہر قصبہ میں جاسوس مقرر کیے گئے جو شیعوں کے حالات پر نظر رکھیں اور جس کے متعلق یہ معلوم ہو کہ وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی محبت کا دم بھرتا ہے اسے گرفتار کیا جائے۔

چنانچہ معلی ابن خنیس ان ہی شیعوں میں سے تھے جو گرفتار کیے گئے اور ظلم وستم کے ساتھ شہید کیے گئے۔ خود امام جعفر صادق علیہ السلام کو تقریباً پانچ مرتبہ مدینہ سے دربار شاہی میں طلب کیا گیا جو آپ کے لیے سخت روحانی تکلیف کا باعث تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کسی مرتبہ آپ کے خلاف کوئی بہانہ اُسے ایسا نہ مل سکا کہ آپ کے قید یا قتل کیے جانے کا حکم دیتا۔ بلکہ اس سلسلہ میں عراق کے اندر ایک مدت کے قیام سے علوم اہلبیتؑ کی اشاعت کا حلقہ وسیع ہوا اور اس کو محسوس کر کے منصور نے پھر آپ کو مدینہ بھجوا دیا۔ اس کے بعد بھی آپ ایذا رسانی سے محفوظ نہیں رہے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ آپ کے گھر میں آگ لگا دی گئی۔ قدرتِ خدا تھی کہ وہ آگ جلد فرو ہو گئی اور آپ کے متعلقین اور اصحاب کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔

اخلاق واوصاف

آپ اسی عصمت کی ایک کڑی تھے جسے خداوندِ عالم نے نوعِ انسانی کے لیے نمونہ کامل بنا کر ہی پیدا کیا تھا۔ ان کے اخلاق واوصاف زندگی کے ہر شعبہ میں معیاری حیثیت رکھتے تھے۔ خاص خاص اوصاف جن کے متعلق مورخین نے مخصوص طور پر واقعات نقل کیے ہیں مہمان نوازی، خیر وخیرات، مخفی طریقہ پر غربا کی خبرگیری، عزیزوں کے ساتھ حسنِ سلوک، عفوِ جرائم، صبر وتحمل وغیرہ ہیں۔

ایک مرتبہ ایک حاجی مدینہ میں وارد ہوا اور مسجدِ رسولؐ میں سو گیا۔ آنکھ کھلی تو اسے

شبہ ہوا کہ اس کی ایک ہزار کی تھیلی موجود نہیں ہے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا کسی کو نہ پایا۔ ایک گوشۂ مسجد میں امام جعفر صادق علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ آپ کو بالکل نہ پہچانتا تھا۔ آپ کے پاس آکر کہنے لگا کہ میری تھیلی تم نے لی ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا، "اس میں کیا تھا؟" اس نے کہا "ایک ہزار دینار"۔ حضرتؑ نے فرمایا۔ "میرے ساتھ میرے مکان تک آؤ" وہ آپ کے ساتھ ہو گیا۔ بیت الشرف پر تشریف لا کر ایک ہزار دینار اس کے حوالے کر دیئے۔ وہ مسجد میں واپس آگیا اور اپنا اسباب اٹھانے لگا تو خود اس کے دیناروں کی تھیلی اسباب میں نظر آئی۔ یہ دیکھ کر وہ بہت شرمندہ ہوا اور دوڑتا ہوا پھر امامؑ کی خدمت میں آیا اور غلط خواہی کرتے ہوئے وہ ہزار دینار واپس کرنا چاہے۔ "ہم جو کچھ دے دیتے ہیں وہ پھر واپس نہیں لیتے"۔

موجودہ زمانے میں یہ حالات سب ہی کی آنکھوں کے دیکھے ہوتے ہیں کہ جب یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ اناج مشکل سے ملے گا تو جس کو جتنا ممکن ہو وہ اناج خرید کر رکھ لیتا ہے مگر امام جعفر صادق علیہ السلام کے کردار کا ایک واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے اپنے وکیل معتب سے ارشاد فرمایا کہ غلہ روز بروز مدینہ میں گراں ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے ہاں کس قدر غلہ ہوگا؟ معتب نے کہا کہ "ہمیں اس گرانی اور قحط کی تکلیف کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس غلہ کا اتنا ذخیرہ ہے جو بہت عرصہ تک کافی ہوگا"۔ حضرتؑ نے فرمایا۔ "یہ تمام غلہ فروخت کر ڈالو۔ اس کے بعد جو حال سب کا ہو وہی ہمارا بھی ہو"۔ جب غلہ فروخت کر دیا گیا تو فرمایا "اب خالص گیہوں کی روٹی نہ پکا کرے بلکہ آدھے گیہوں اور آدھے جو۔ جہاں تک ممکن ہو ہمیں غریبوں کا ساتھ دینا چاہیے"۔

آپ کا قاعدہ تھا کہ آپ مالداروں سے زیادہ غریبوں کی عزت کرتے تھے۔ مزدوروں کی بڑی قدر فرماتے تھے۔ خود بھی تجارت فرماتے تھے اور اکثر اپنے باغوں میں بہ نفسِ نفیس محنت بھی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ بیلچہ ہاتھ میں لیے باغ میں کام کر رہے تھے اور پسینہ سے تمام جسم تر ہو گیا تھا۔ کسی نے کہا، "یہ بیلچہ مجھے عنایت فرمایئے کہ میں یہ خدمت انجام دوں"۔ حضرتؑ نے فرمایا، "طلبِ معاش میں دھوپ اور گرمی کی تکلیف

سہنا عیب کی بات نہیں،" غلاموں اور کنیزوں پر وہی مہربانی رہتی تھی جو اس گھرانے کی امتیازی صفت تھی۔ اس کا ایک حیرت انگیز نمونہ یہ ہے جسے سفیان ثوری نے بیان کیا ہے کہ میں ایک مرتبہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دیکھا کہ چہرہ مبارک کا رنگ متغیر ہے۔ میں نے سبب دریافت کیا۔ فرمایا۔ میں نے منع کیا تھا کہ کوئی مکان کے کوٹھے پر نہ چڑھے۔ اس وقت جو گھر میں گیا تو دیکھا کہ ایک کنیز جو ایک بچہ کی پرورش پر معین تھی اسے گود میں لیے زینہ سے اوپر جا رہی ہے۔ مجھے دیکھا تو ایسا خوف طاری ہوا کہ بدحواسی میں بچہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس صدمے سے جان بحق ہوا۔ مجھے بچے کے مرنے کا اتنا صدمہ نہیں ہوا جتنا اس کا رنج ہے کہ اس کنیز پر اتنا رعب و ہراس کیوں طاری ہوا۔ پھر حضرتؑ نے اس کنیز کو پکار کر فرمایا۔ "ڈرو نہیں، میں نے تمہیں راہِ خدا میں آزاد کر دیا۔" اس کے بعد حضرتؑ بچے کی تجہیز و تکفین کی طرف متوجہ ہوتے۔

اشاعتِ علوم

تمام عالمِ اسلامی میں آپ کی علمی جلالت کا شہرہ تھا۔ دور دور سے لوگ تحصیلِ علم کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے شاگردوں کی تعداد چار ہزار تک پہنچ گئی تھی ان میں فقہ کے علماء بھی تھے، تفسیر کے متکلمین بھی تھے اور مناظرین بھی، آپ کے دربار میں مخالفینِ مذہب آ آ کر سوالات پیش کرتے تھے اور آپ کے اصحاب سے اور ان سے مناظرے ہوتے رہتے تھے جن پر کبھی کبھی مناظرے کے ختم ہونے پر اور فریق مخالف کے شکست کھا کر چلے جانے کے بعد آپ نقد و تبصرہ بھی فرماتے تھے اور اصحاب کو ان کی بحث کے کمزور پہلو بتلا بھی دیتے تھے تاکہ آئندہ وہ ان باتوں کا خیال رکھیں۔ کبھی آپ خود بھی مخالفین مذہب اور بالخصوص دہریوں سے مناظرہ فرماتے تھے۔ علاوہ علوم و فقہ و کلام وغیرہ کے علوم غریبہ جیسے ریاضی اور کیمیا وغیرہ کی بھی بعض شاگردوں کو تعلیم دی تھی۔ چنانچہ آپ کے اصحاب میں سے جابر بن حیان

maablib.org

طرسوسی سائنس اور ریاضی کے مشہور امام فن ہیں جنھوں نے چار سو رسالے امام جعفر صادق علیہ السلام کے افادات کو حاصل کر کے تصنیف کئے۔ آپ کے اصحاب میں سے بہت سے بڑے فقہا تھے جنہوں نے کتابیں تصنیف کیں جن کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔

وفات

ایسی مصروف زندگی رکھنے والے انسان کو جاہ و سلطنت کے حاصل کرنے کی فکروں سے کیا مطلب؟ مگر آپ کی علمی مرجعیّت اور کمالات کی شہرت سلطنتِ وقت کے لیے ایک مستقل خطرہ محسوس ہوتی تھی۔ جب کہ یہ معلوم تھا کہ اصلی خلافت کے حقدار یہی ہیں۔ جب حکومت کی تمام کوششوں کے باوجود کوئی بہانہ اسے آپ کے خلاف کسی کھلے ہوئے اقدام اور خونریزی کا نہ مل سکا تو آخر خاموش حربہ زہر کا اختیار کیا گیا اور زہر آلود انگور حاکم مدینہ کے ذریعہ سے آپ کی خدمت میں پیش کیے گئے، جن کے کھاتے ہی زہر کا اثر جسم میں سرایت کر گیا اور ۱۵ شوال ۱۴۸ھ میں ۶۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کے فرزندِ اکبر اور جانشین حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے تجہیز و تکفین کی اور نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع کے اس احاطہ میں جہاں اس کے پہلے امام حسن علیہ السلام، امام زین العابدینؑ اور امام محمد باقر علیہ السلام دفن ہو چکے تھے آپ کو بھی دفن کیا گیا۔

maablib.org

ساتویں امام

حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام

نام و نسب

اسم مبارک موسیٰؑ، کنیت ابوالحسنؑ اور لقب کاظمؑ تھا اور اسی لیے امام موسیٰ کاظمؑ کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام تھے جن کا خاندانی سلسلہ حضرت امام حسینؑ شہیدِ کربلا کے واسطہ سے پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک پہنچتا ہے۔

آپ کی والدہ ماجدہ حمیدہؑ خاتون ملکِ بربر کی باشندہ تھیں۔

ولادت

سات صفر ۱۲۸ھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ اس وقت آپ والد بزرگوار حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام مسندِ امامت پر متمکن تھے اور آپ کے فیوض علمی کا دھارا پوری طاقت کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ اگرچہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے پہلے آپ کے دو بڑے بھائی اسمٰعیل اور عبداللہ پیدا ہو چکے تھے مگر اس صاحبزادے کی ولادت سے گھرانے کو وہ خوشی ہوئی جو اس سے پہلے محسوس نہیں ہوئی تھی اس لیے اس روحانی امانت کا حامل جو رسولؐ کے بعد اس سلسلہ کے افراد میں ایک دوسرے کے بعد چلی آ رہی تھی، یہی پیدا ہونے والا مبارک بچہ تھا۔

نشوونما اور تربیت

آپ کی عمر کے بیس برس اپنے والد بزرگوار امام جعفر صادق علیہ السّلام کے سایۂ تربیت میں گزرے۔ ایک طرف خدا کے دیئے ہوئے فطری کمال کے جوہر اور دوسری طرف اس باپ کی تربیت جس نے پیغمبرؐ کے بتائے ہوئے مکارمِ اخلاق کی یاد کو بھولی ہوئی دنیا میں ایسا تازہ کر دیا کہ انھیں ایک طرح سے اپنا بنا لیا اور جس کی بناء پر "ملت جعفری" نام ہو گیا۔ امام موسیٰ کاظمؑ نے بچپنہ اور جوانی کا کافی حصہ اسی مقدس آغوشِ تعلیم میں گزارا۔ یہاں تک کہ تمام دنیا کے سامنے آپ کے ذاتی کمالات وفضائل روشن ہو گئے اور امام جعفر صادقؑ نے اپنا جانشین مقرر فرما دیا۔ باوجود کہ آپ کے بڑے بھائی بھی موجود تھے مگر خدا کی طرف کا منصب میراث کا ترکہ نہیں ہے بلکہ ذاتی کمال کو ڈھونڈتا ہے۔ سلسلہ معصومینؑ میں امام حسنؑ کے بعد بجائے ان کی اولاد کے امام حسینؑ کا امام ہونا اور اولاد امام جعفر صادق علیہ السلام میں بجائے فرزند اکبر کے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی طرف امامت کا منتقل ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ معیار امامت میں نسبتی وراثت کو مدِ نظر نہیں رکھا گیا ہے۔

امامت

۱۴۸ھ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی شہادت ہوئی۔ اس وقت سے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام بذاتِ خود فرائضِ امامت کے ذمہ دار ہوئے۔ اس وقت سلطنتِ عباسیہ کے تخت پر منصور دوانقی بادشاہ تھا۔ یہ وہی ظالم بادشاہ تھا جس کے ہاتھوں لاتعداد سادات مظالم کا نشانہ بن چکے تھے تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گیے۔ دیواروں میں چنوا دیئے گئے یا قید رکھے گئے تھے۔ خود امام جعفر صادق علیہ السلام کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کی جا چکی تھیں اور مختلف صورت سے تکلیفیں پہنچائی گئی تھیں۔ یہاں تک کہ منصور ہی کا بھیجا ہوا زہر تھا جس سے اب آپ دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔

ان حالات میں آپ کو اپنے جانشین کے متعلق یہ قطعی اندیشہ تھا کہ حکومت وقت اسے زندہ نہ رہنے دے گی اس لیے آپ نے آخری وقت ایک اخلاقی بوجھ حکومت کے کاندھوں پر رکھ دینے کے لیے یہ صورت اختیار فرمائی کہ اپنی جائداد اور گھر بار کے انتظام کے لیے پانچ شخصوں کی ایک جماعت مقرر فرمائی۔ جن میں پہلا شخص خود خلیفہ وقت منصور عباسی تھا۔ اس کے علاوہ محمد بن سلیمان حاکم مدینہ اور عبداللہ فطح جو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے سن میں بڑے بھائی تھے اور حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اور ان کی والدہ معظمہ حمیدہؑ خاتون۔

امام کا اندیشہ بالکل صحیح تھا اور آپ کا تحفظ بھی کامیاب ثابت ہوا چنانچہ جب حضرت کی وفات کی اطلاع منصور کو پہنچی تو اس نے پہلے تو سیاسی مصلحت کے طور پر اظہارِ رنج کیا۔ تین مرتبہ انا للہ وانا الیہ راجعون کہا اور کہا کہ اب بھلا جعفرؑ کا مثل کون ہے؟ اس کے بعد حاکمِ مدینہ کو لکھا کہ اگر جعفرِ صادقؑ نے کسی شخص کو اپنا وصی مقرر کیا ہو تو اس کا سر فوراً قلم کر دو۔ حاکم مدینہ نے جواب لکھا کہ انہوں نے تو پانچ وصی مقرر کیے ہیں جن سے پہلے آپ خود ہیں۔ یہ جواب پڑھ کر منصور دیر تک خاموش رہا اور سوچنے کے بعد کہنے لگا تو اس صورت میں تو یہ لوگ قتل نہیں کیے جا سکتے۔ اس کے بعد دس برس منصور زندہ رہا لیکن امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے کوئی تعرض نہیں کیا اور آپ مذہبی فرائض امامت کی انجام دہی میں امن و سکون کے ساتھ مصروف رہے۔ یہ بھی تھا کہ اس زمانے میں منصور شہر بغداد کی تعمیر میں مصروف تھا جس سے ۱۵۷ھ میں یعنی اپنی موت سے صرف ایک سال پہلے اسے فراغت ہوئی۔ اس لیے وہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے متعلق کسی ایذا رسانی کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔

دورِ ابتلا

۱۵۸ھ کے آخر میں منصور دوانقی دنیا سے رخصت ہوا اور اس کا بیٹا مہدی تختِ سلطنت پر بیٹھا۔ شروع میں تو اس نے بھی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے عزت و احترام

کے خلاف کوئی برتاؤ نہیں گیا مگر چند سال کے بعد پھر وہی بنی فاطمہؑ کی مخالفت کا جذبہ ابھرا اور ۱۶۴ھ میں جب وہ حج کے نام سے حجاز کی طرف آیا تو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو اپنے ساتھ مکہ سے بغداد لے گیا اور قید کر دیا۔ ایک سال تک حضرتؑ اس کی قید میں رہے۔ پھر اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور حضرتؑ کو مدینہ کی طرف واپسی کا موقع دیا گیا۔ مہدی کے بعد اس کا بھائی ہادی ۱۶۹ھ میں تخت سلطنت پر بیٹھا اور صرف ایک سال ایک مہینے تک اُس نے سلطنت کی۔ اس کے بعد ہارون رشید کا زمانہ آیا جس میں پھر امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو آزادی کے ساتھ سانس لینا نصیب نہیں ہوا۔

اخلاق واوصاف

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اسی مقدس سلسلے کے ایک فرد تھے جس کو خالق نے نوع انسان کے لیے معیارِ کمال قرار دیا تھا۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک اپنے وقت میں بہترین اخلاق واوصاف کا مرقع تھا۔ بے شک یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض افراد میں بعض صفات اتنے ممتاز نظر آتے ہیں کہ سب سے پہلے ان پر نظر پڑتی ہے۔ چنانچہ ساتویں امامؑ میں تحمل وبرداشت اور غصہ کو ضبط کرنے کی صفت اتنی نمایاں تھی کہ آپ کا لقب "کاظم" قرار پا گیا جس کے معنی ہیں غصے کو پینے والا۔ آپ کو کبھی کسی نے ترشروئی اور سختی کے ساتھ بات کرتے نہیں دیکھا اور انتہائی ناگوار حالات میں بھی مسکراتے ہوتے نظر آئے۔ مدینے کے ایک حاکم سے آپ کو سخت تکلیفیں پہنچیں یہاں تک کہ وہ جناب امیر علیہ السلام کی شان میں بھی نازیبا الفاظ استعمال کیا کرتا تھا مگر حضرتؑ نے اپنے اصحاب کو ہمیشہ اس کے جواب دینے سے روکا۔

جب اصحاب نے اس کی گستاخیوں کی بہت شکایات کیں اور یہ کہا کہ اب ہمیں ضبط کی تاب نہیں۔ ہمیں اس سے انتقام لینے کی اجازت دی جائے تو حضرتؑ نے فرمایا کہ "میں خود اس کا تدارک کرونگا"۔ اس طرح ان کے جذبات میں سکون پیدا کرنے کے بعد حضرتؑ خود اس شخص کے پاس اس کی زراعت پر تشریف لے گئے اور کچھ ایسا

احسان اور سلوک فرمایا کروہ اپنی گستاخیوں پر نادم ہوا اور اپنے طرزِ عمل کو بدل دیا۔ حضرتؑ نے اپنے اصحاب سے صورت حال بیان فرما کر پوچھا کہ جو میں نے اسکے ساتھ کیا وہ اچھا تھا یا جس طرح تم لوگ اس کے ساتھ کرنا چاہتے تھے۔ سب نے کہا یقیناً حضورؑ نے جو طریقہ استعمال فرمایا وہی بہتر تھا۔ اس طرح آپ نے اپنے جدِ بزرگوار حضرت امیر علیہ السلام کے اس ارشاد کو عمل میں لاکر دکھلایا جو آج تک نہج البلاغہ میں موجود ہے کہ اپنے دشمن پر احسان کے ساتھ فتح حاصل کرو کیونکہ یہ دو قسم کی فتح میں زیادہ پُر لطف کامیابی ہے۔ بیشک اس کے لیے فریقِ مخالف کے ظرف کا صحیح اندازہ ضروری ہے اور اسی لیے حضرت علیؑ نے ان الفاظ کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ "خبردار یہ عدم تشدد کا طریقہ نااہل کے ساتھ اختیار نہ کرنا ورنہ اس کے تشدد میں اضافہ ہو جائے گا"

یقیناً ایسے عدم تشدد کے موقع کو پہچاننے کے لیے ایسی ہی بالغ نگاہ کی ضرورت ہے جیسی امامؑ کو حاصل تھی مگر یہ اس وقت میں ہے جب مخالف کی طرف سے کوئی ایسا عمل ہو چکا ہو جو اس کے ساتھ انتقامی تشدد کا جواز پیدا کر سکے لیکن اس کی طرف سے اگر کوئی اقدام ابھی ایسا نہ ہوا تو یہ حضرات بہرحال اس کے ساتھ احسان کرنا پسند کرتے تھے تاکہ اس کے خلاف حجت قائم ہو اور اسے اپنے جارحانہ اقدام کے لیے تلاش سے بھی کوئی عذر نہ مل سکے۔ بالکل اسی طرح جیسے ابنِ ملجم کے ساتھ جو جناب امیر علیہ السلام کو شہید کرنے والا تھا۔ آخری وقت تک جناب امیر علیہ السلام احسان فرماتے رہے۔ اسی طرح محمد ابنِ اسمٰعیل کے ساتھ جو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی جان لینے کا باعث ہوا۔ آپ برابر احسان فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ اس سفر کے لیے جو اس نے مدینے سے بغداد کی جانب خلیفہ عباسی کے پاس امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شکایتیں کرنے کے لیے کیا تھا۔ ساڑھے چار سو دینار اور پندرہ سو درہم کی رقم خود حضرتؑ ہی نے عطا فرمائی تھی جس کو لے کر وہ روانہ ہوا تھا۔ آپ کو زمانہ بہت ناساز گار ملا تھا۔ نہ اس وقت وہ علمی دربار قائم رہ سکتا تھا جو امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانہ میں قائم رہ چکا تھا نہ دوسرے ذرائع سے تبلیغ و اشاعت ممکن تھی۔ بس آپ

کی خاموش سیرت ہی تھی جو دنیا کو آلِ محمدؑ کی تعلیمات سے روشناس کرا سکتی تھی۔

آپ اپنے مجمعوں میں بھی اکثر بالکل خاموش رہتے تھے یہاں تک کہ جب تک آپ سے کسی امر کے متعلق کوئی سوال نہ کیا جائے آپ گفتگو میں ابتدا بھی نہ فرماتے تھے۔ اس کے باوجود آپ کی علمی جلالت کا سکہ دوست اور دشمن سب کے دل پر قائم تھا اور آپ کی سیرت کی بلندی کو بھی سب مانتے تھے۔ اسی لیے عام طور پر آپ کو کثرت عبادت اور شب زندہ داری کی وجہ سے "عبد صالح" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ آپ کی سخاوت اور فیاضی کا بھی خاص شہرہ تھا اور فقراء مدینہ کی اکثر پوشیدہ طور پر خبر گیری فرماتے تھے ہر نماز صبح کے تعقیبات کے بعد آفتاب کے بلند ہونے کے بعد سے پیشانی سجدے میں رکھ دیتے تھے اور زوال کے وقت سر اٹھاتے تھے۔ قرآنِ مجید اور پاس بیٹھنے والے بھی آپ کی آواز سے متاثر ہو کر روتے تھے۔

ہارون رشید کی خلافت اور امام موسیٰ کاظمؑ سے مخالفت

۱۷۰ھ میں ہادی کے بعد ہارون تختِ خلافت پر بیٹھا۔ سلطنتِ عباسیہ کے قدیم روایات جو سادات بنی فاطمہؑ کی مخالفت میں تھے اس کے سامنے تھے خود اس کے باپ منصور کا رویہ جو امام جعفر صادقؑ کے خلاف تھا اسے معلوم تھا اس کا یہ ارادہ کہ جعفر صادقؑ کے جانشین کو قتل کر ڈالا جائے یقیناً اس کے بیٹے ہارون کو معلوم ہو چکا ہو گا۔ وہ تو امام جعفر صادقؑ کی حکیمانہ وصیت کا اخلاقی دباؤ تھا جس نے منصور کے ہاتھ باندھ دیئے تھے اور شہر بغداد کی تعمیر کی مصروفیت تھی جس نے اسے اس جانب متوجہ نہ ہونے دیا تھا اب ہارون کے لیے ان میں سے کوئی بات مانع نہ تھی۔ تختِ سلطنت پر بیٹھ کر اپنے اقتدار کو مضبوط رکھنے کے لیے سب سے پہلے یہی تصور پیدا ہو سکتا تھا کہ اس روحانیت کے مرکز کو جو مدینہ کے محلہ بنی ہاشم میں قائم ہے توڑنے کی کوشش کی جائے مگر ایک طرف امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا محتاط اور خاموش طرزِ عمل اور دوسری

طرف سلطنت کے اندرونی مشکلات ان کی وجہ سے نو برس تک ہارون کو بھی کسی کھلے ہوئے تشدد کا امامؑ کے خلاف موقع نہیں ملا۔

اس دوران میں عبداللہ ابن حسنؑ کے فرزند یحییٰ کا واقعہ درپیش ہوا اور وہ امان دیئے جانے کے بعد تمام عہد و پیمان کو توڑ کر دردناک طریقے پر پہلے قید رکھے گئے اور پھر قتل کیے گئے۔ باوجودیکہ یحییٰ کے معاملات سے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو کسی طرح کا سروکار نہ تھا بلکہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرتؑ ان کو حکومتِ وقت کی مخالفت سے منع فرماتے تھے مگر عداوتِ بنی فاطمہؑ کا جذبہ جو یحییٰ ابن عبداللہ کی مخالفت کے بہانے سے ابھر گیا تھا اس کی زد سے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ ادھر یحییٰ ابن خالد برمکی نے جو وزیر اعظم تھا امین (فرزند ہارون رشید) کے اتالیق جعفر ابن محمد اشعث کی رقابت میں اس کے خلاف یہ الزام قائم کیا کہ یہ امام موسیٰؑ کاظم کے شیعوں میں سے ہے اور ان کے اقتدار کا خواہاں ہے۔

براہ راست اس کا مقصد ہارون کو جعفر سے برگشتہ کرنا تھا لیکن بالواسطہ اس کا تعلق حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے ساتھ بھی تھا۔ اس لیے ہارون کو حضرتؑ کی ضرر رسانی کی فکر پیدا ہو گئی۔ اسی دوران میں یہ واقعہ ہوا کہ ہارون رشید حج کے ارادے سے مکہ معظمہ میں آیا۔ اتفاق سے اسی سال امام موسیٰ کاظمؑ بھی حج کو تشریف لاتے ہوئے تھے۔ ہارون نے اپنی آنکھ سے اس عظمت اور مرجعیت کا مشاہدہ کیا جو مسلمانوں میں امام موسیٰ کاظمؑ کے متعلق پائی جاتی تھی۔ اس سے بھی اس کے حسد کی آگ بھڑک اٹھی اس کے بعد اس میں محمد بن اسمٰعیل کی مخالفت نے اور اضافہ کر دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اسمٰعیل امام جعفر صادق علیہ السلام کے بڑے فرزند تھے اور اس لیے ان کی زندگی میں عام طور پر لوگوں کا خیال یہ تھا کہ وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے قائمقام ہوں گے۔ مگر ان کا انتقال امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے میں ہو گیا اور لوگوں کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ پھر بھی بعض سادہ لوح اصحاب اس خیال پر قائم رہے کہ جانشینی کا حق اسمٰعیل اور اولاد اسمٰعیل میں منحصر ہے۔ انھوں نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی امامت

maablib.org

کو تسلیم نہیں کیا چنانچہ اسماعیلیہ فرقہ مختصر تعداد میں سہی اب بھی دنیا میں موجود ہے۔ محمدؐ ان ہی اسمٰعیل کے فرزند تھے اور اس لیے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ایک طرح کی مخالفت پہلے سے رکھتے تھے مگر چونکہ ان کے ماننے والوں کی تعداد بہت کم تھی اور وہ افراد کوئی نمایاں حیثیت نہ رکھتے تھے اسی لیے ظاہری طور پر امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے یہاں آمد و رفت رکھتے تھے اور ظاہر داری کے طور پر قرابت داری کے تعلقات قائم کیے ہوئے تھے۔

ہارون رشید نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی مخالفت کی صورتوں پر غور کرتے ہوئے یحییٰ برمکی سے مشورہ لیا کہ میں چاہتا ہوں کہ اولادِ ابو طالبؑ میں سے کسی کو بلا کر اس سے موسیٰ بن جعفرؑ کے پورے پورے حالات دریافت کروں۔ یحییٰ جو خود عداوتِ بنی فاطمہؑ میں ہارون سے کم نہ تھا اس نے محمد بن اسمٰعیل کا پتہ دیا کہ آپ ان کو بلا کر دریافت کریں تو صحیح حالات معلوم ہو سکیں گے چنانچہ اسی وقت محمد بن اسمٰعیل کے نام خط لکھا گیا۔

شہنشاہِ وقت کا خط محمد ابن اسمٰعیل کو پہنچا تو انھوں نے اپنی دنیوی کامیابی کا بہترین ذریعہ سمجھ کر فوراً بغداد جانے کا ارادہ کر لیا۔ مگر ان دنوں ہاتھ بالکل خالی تھا۔ اتنا روپیہ پاس موجود نہ تھا کہ سامانِ سفر کرتے۔ مجبوراً اسی ڈیوڑھی پر آنا پڑا جہاں کرم و عطا میں دوست اور دشمن کی تمیز نہ تھی۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے پاس آکر بغداد جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ حضرتؑ خوب سمجھتے تھے کہ اس بغداد کے سفر کی بنیاد کیا ہے۔ حجت تمام کرنے کی غرض سے آپ نے سفر کا سبب دریافت کیا۔ انھوں نے اپنی پریشان حالی بیان کرتے ہوئے کہا کہ قرضدار بہت ہو گیا ہوں۔ خیال کرتا ہوں کہ شاید وہاں جا کر کوئی صورت بسر اوقات کی نکلے اور میرا قرضہ ادا ہو جائے۔ حضرتؑ نے فرمایا۔ وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا تمام قرضہ ادا کر دوں گا۔

افسوس ہے کہ محمد نے اس کے بعد بھی بغداد جانے کا ارادہ نہیں بدلا۔ چلتے وقت حضرتؑ سے رخصت ہونے لگے۔ عرض کیا کہ مجھے وہاں کے متعلق کچھ ہدایت فرمائی

جائیے۔ حضرتؑ نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ جب انھوں نے کئی مرتبہ اصرار کیا تو حضرتؑ نے فرمایا کہ "بس اتنا خیال رکھنا کہ میرے خون میں شریک نہ ہونا اور میرے بچوں کی یتیمی کے باعث نہ ہونا"۔ محمد نے اس کے بعد بہت کہا کہ یہ بھلا کون سی بات ہے جو مجھ سے کہی جاتی ہے، کچھ اور ہدایت فرمایئے۔ حضرتؑ نے اس کے علاوہ کچھ کہنے سے انکار کیا۔ جب وہ چلنے لگے تو حضرتؑ نے ساڑھے چار سو دینار اور پندرہ سو درہم انھیں مصارف کے لیے عطا فرمائے۔ نتیجہ وہی ہوا جو حضرتؑ کے پیش نظر تھا۔ محمد ابن اسمٰعیل بغداد پہنچے اور وزیر اعظم یحیٰی برمکی کے مہمان ہوئے اس کے بعد یحییٰ کے ساتھ ہارون کے دربار میں پہنچے مصلحتِ وقت کی بنا پر بہت تعظیم و تکریم کی گئی۔ اثنائے گفتگو میں ہارون نے مدینہ کے حالات دریافت کیے۔ محمد نے انتہائی غلط بیانیوں کے ساتھ وہاں کے حالات کا تذکرہ کیا اور یہ بھی کہا کہ میں نے آج تک نہیں دیکھا اور نہ سنا کہ ایک ملک میں دو بادشاہ ہوں۔ اس نے کہا کہ اس کا کیا مطلب؟ محمد نے کہا کہ بالکل اسی طرح جس طرح آپ بغداد میں سلطنت کر رہے ہیں۔ موسیٰ کاظمؑ مدینہ میں اپنی سلطنت قائم کیے ہوئے ہیں۔ اطرافِ ملک سے ان کے پاس خراج پہنچتا ہے اور وہ آپ کے مقابلے کے دعوے دار ہیں۔

یہی وہ باتیں تھیں جن کے کہنے کے لیے یحیٰی برمکی نے محمد کو منتخب کیا تھا ہارون کا غیظ و غضب انتہائی اشتعال کے درجے تک پہنچ گیا۔ اس نے محمد کو دس ہزار دینار عطا کر کے رخصت کیا۔ خدا کا کرنا یہ کہ محمد کو اس رقم سے فائدہ اٹھانے کا ایک دن بھی موقع نہ ملا۔ اسی شب کو ان کے حلق میں درد پیدا ہوا۔ صبح ہوتے ہوئے وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ہارون کو یہ خبر پہنچی تو اس نے اشرفیوں کے توڑے واپس منگوا لیے مگر محمد کی باتوں کا اثر اس کے دل میں ایسا جم گیا تھا کہ اس نے یہ طے کر لیا کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔

چنانچہ ۱۷۹ھ میں پھر ہارون رشید نے مکہ معظمہ کا سفر کیا اور وہاں سے مدینہ منورہ گیا۔ دو ایک روز قیام کے بعد کچھ لوگ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ

کیے۔ جب یہ لوگ امامؑ کے مکان پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ حضرتؑ روضۂ رسولؐ پر ہیں۔ ان لوگوں نے روضہ پیغمبرؐ کی عزت کا بھی خیال نہ کیا۔ حضرتؑ اس وقت قبر رسولؐ کے نزدیک نماز میں مشغول تھے۔ بے رحم دشمنوں نے آپ کو نماز کی حالت میں ہی قید کر لیا اور ہارون کے پاس لے گئے۔ مدینہ رسولؐ کے رہنے والوں کی بے حسی اس کے پہلے بھی بہت دفعہ دیکھی جا چکی تھی۔ یہ بھی اس کی ایک مثال تھی کہ رسولؐ کا فرزند روضۂ رسولؐ سے اس طرح گرفتار کر کے لے جایا جا رہا تھا مگر نام نہاد مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو کسی طرح کی آواز بطور احتجاج بلند کرتا۔ یہ بیس شوال ۱۷۹ھ کا واقعہ ہے۔

ہارون نے اس اندیشے سے کہ کوئی جماعت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو رہا کرنے کی کوشش نہ کرے دو محملیں تیار کرائیں۔ ایک میں حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو سوار کیا اور اس کو ایک بڑی فوجی جمعیت کے حلقے میں بصرہ روانہ کیا اور دوسری محمل جو خالی تھی اسے بھی اتنی ہی جمعیت کی حفاظت میں بغداد روانہ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ آپ کے محل قیام اور قید کی جگہ کو بھی مشکوک بنا دیا جائے یہ نہایت حسرت ناک واقعہ تھا کہ امامؑ کے اہلِ حرم اور بچے وقتِ رخصت آپ کو دیکھ بھی نہ سکیں اور اچانک محلسرا میں صرف یہ اطلاع پہنچ سکی کہ حضرتؑ سلطنتِ وقت کی طرف سے قید کر لیے گئے اس سے بی بیوں اور بچوں میں کہرام برپا ہو گیا اور یقیناً امامؑ کے دل پر بھی اس کا جو صدمہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ مگر آپ کے ضبط و صبر کی طاقت کے سامنے ہر مشکل آسان تھی۔

معلوم نہیں کتنے ہیر پھیر سے یہ راستہ طے کیا گیا تھا کہ پورے ایک مہینہ سترہ روز کے بعد سات ذی الحجہ کو آپ بصرہ پہنچائے گئے۔ کامل ایک سال تک آپ بصرہ میں قید رہے۔ یہاں کا حاکم ہارون کا چچا زاد بھائی عیسیٰ ابن جعفر تھا شروع میں تو اسے صرف بادشاہ کے حکم کی تعمیل مدِ نظر تھی بعد میں اس نے غور کرنا شروع کیا۔ آخر ان کے قید کیے جانے کا سبب کیا ہے۔ اس سلسلے میں اس کو امامؑ کے حالات اور سیرتِ زندگی اور اخلاق و اوصاف کی جستجو کا موقع بھی ملا اور جتنا اس نے امامؑ کی سیرت کا مطالعہ کیا اتنا اس کے دل پر آپ

کی بلندی اخلاق اور حسن کردار کا اثر قائم ہو گیا۔ اپنے ان تاثرات سے اس نے ہارون کو مطلع بھی کر دیا۔ ہارون پر اس کا الٹا اثر ہوا کہ عیسیٰ کے متعلق بدگمانی پیدا ہو گئی۔ اس لیے اس نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو بغداد میں بلا بھیجا۔ فضل ابن ربیع کی حراست میں دے دیا اور پھر فضل کا رجحان شیعیت کی طرف محسوس کر کے یحییٰ برمکی کو اس کے لیے مقرر کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ کے اخلاق و اوصاف کی کشش ہر ایک پر اپنا اثر ڈالتی تھی۔ اس لیے ظالم بادشاہ کو نگرانوں کی تبدیلی کی ضرورت پڑتی تھی۔

وفات

سب سے آخر میں امامؑ سندی بن شاہک کے قید خانے میں رکھے گئے یہ شخص بہت ہی بے رحم اور سخت دل تھا۔ آخر اسی قید میں حضرتؑ کو انگور میں زہر دیا گیا۔ ۲۵ رجب ۱۸۳ھ میں ۵۵ سال کی عمر میں حضرتؑ کی وفات ہوئی بعد وفات آپ کی نعش کے ساتھ بھی کوئی اعزاز کی صورت اختیار نہیں کی گئی بلکہ حیرتناک طریقے پر توہین آمیز الفاظ کے ساتھ اعلان کرتے ہوئے آپ کی لاش کو قبرستان کی طرف روانہ کیا گیا۔ مگر اب ذرا عوام میں احساس پیدا ہو گیا تھا اس لیے کچھ اشخاص نے امامؑ کے جنازے کو لے لیا اور پھر عزت و احترام کے ساتھ مشایعت کر کے بغداد سے باہر اس مقام پر جو اب کاظمین کے نام سے مشہور ہے دفن کیا۔

maablib.org

MAAB 1431
مرکز احیاء آثار برّیّة
صغیر
maablib.org

آٹھویں امام

حضرت علی رضا علیہ السّلام

نام ونسب

علیؑ نام، رضا لقب اور ابو الحسن کنیت. حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام والد بزرگوار تھے اور اس لیے آپ کو پورے نام و لقب کے ساتھ یاد کیا جاتے تو امام الحسن علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام کہا جائے گا. والدہ گرامی کی کنیت ام البنینؑ اور لقب طاہرہ تھا. نہایت عبادت گزار بی بی تھیں.

ولادت

۱۱ ذی القعدہ ۱۴۸ھ میں مدینہ منورہ میں ولادتؒ ہوئی. اس کے تقریباً ایک ماہ قبل ۱۵ شوال کو آپ کے جد بزرگوار امام جعفر صادق علیہ السلام کی وفات ہوچکی تھی. اتنے عظیم حادثہ مصیبت کے بعد جلد ہی اسی مقدس مولود کے دنیا میں آجانے سے یقیناً تمام گھرانے میں ایک سکون اور تسلی محسوس کی گئی.

maablib.org

تربیت

آپ کی نشوونما اور تربیت اپنے والد بزرگوار حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے زیر سایہ ہوئی اور اسی مقدس ماحول میں بچپنا اور جوانی کی متعدد منزلیں طے ہوئیں اور پینتیس برس کی عمر پوری ہوئی. اگرچہ آخری چند سال اس مدت کے وہ تھے جب امام موسیٰؑ کاظمؑ عراق میں قید وظلم کی سختیاں برداشت کر رہے تھے مگر اس سے پہلے ۲۸ یا ۲۹ برس

آپ کو برابر اپنے پدرِ بزرگوار کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔

جانشینی

امام موسیٰؑ کاظم کو معلوم تھا کہ حکومت وقت آپ کو آزادی سے سانس لینے نہ دے گی اور ایسے حالات پیش آجائیں گے کہ آپ کے آخری عمر کے حصے میں اور دنیا کو چھوڑنے کے موقع پر دوستانِ اہلبیتؑ کا آپ سے ملنا یا بعد کے لیے رہنما کا دریافت کرنا غیر ممکن ہو جائے گا۔ اس لیے آپ نے انہی آزادی کے دنوں اور سکون کے اوقات میں جب کہ آپ مدینہ میں تھے پیروانِ اہلبیتؑ کو اپنے بعد ہونے والے امامؑ سے روشناس بنانے کی ضرورت محسوس فرمائی۔ چنانچہ اولاد علیؑ و فاطمہؑ میں سے سترہ آدمی جو ممتاز حیثیت رکھتے تھے جمع فرما کر اپنے فرزند علی رضاؑ کی وصایت و جانشینی کا اعلان فرمایا اور ایک وصیت نامہ تحریراً بھی مکمل فرمایا، جس پر مدینہ کے معززین میں سے ساٹھ آدمیوں کی گواہی لکھی گئی۔ یہ اہتمام دوسرے آئمہ کے یہاں نظر نہیں آتا۔ صرف ان خصوصی حالات کی بنا پر جن سے دوسرے آئمہ اپنی وفات کے موقع پر دوچار نہیں ہونے والے تھے۔

دورِ امامت

حضرت امام رضا علیہ السلام کی پینتیس برس کی عمر تھی جب آپ کے والدِ بزرگوار حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی وفات ہوئی اور امامت کی ذمہ داری آپ کی طرف منتقل ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب بغداد میں ہارون رشید تختِ خلافت پر تھا اور بنی فاطمہؑ کے لیے حالات بہت ناسازگار تھے۔ اس ناخوشگوار ماحول میں حضرتؑ نے خاموشی کے ساتھ شریعتِ حقہ کے خدمات انجام دینا شروع کر دیئے۔

علمی کمال

آلِ محمدؑ کے اس سلسلہ میں ہر فرد حضرتِ احدیت کی طرف سے بلند ترین علم کے درجہ پر قرار دیا گیا تھا جسے دوست اور دشمن سب کو ماننا پڑتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کو علمی فیوض پھیلانے کا زمانے نے کم موقعہ دیا اور کسی کو زیادہ، چنانچہ ان حضرات میں سے امام جعفر صادقؑ کے بعد اگر کسی کو سب سے زیادہ موقع حاصل ہوا ہے تو وہ امام رضا علیہ السلام ہیں۔ جب آپ امامت کے منصب پر نہیں پہنچے تھے اس وقت حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اپنے تمام فرزندوں اور خاندان کے لوگوں کو نصیحت فرماتے تھے کہ تمھارے بھائی علی رضاؑ عالم آل محمدؑ ہیں۔ اپنے دینی مسائل کو ان سے دریافت کر لیا کرو اور جو کچھ وہ کہیں اسے یاد رکھو اور پھر حضرت موسیٰ کاظمؑ کی وفات کے بعد جب آپؑ مدینہ میں تھے اور روضہ رسولؐ پر تشریف فرما رہے تھے تو علمائے اسلام مشکل مسائل میں آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ محمد ابنِ عیسیٰ القطینی کا بیان ہے کہ میں نے ان تحریری مسائل کو جو حضرت امام رضاؑ سے پوچھے گئے تھے اور آپ نے ان کا جواب تحریر فرمایا تھا اکٹھا کیا تو اٹھارہ ہزار کی تعداد میں تھے۔

زندگی کے مختلف دور

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے بعد دس برس ہارون کا دور رہا۔ یقیناً وہ امام رضاؑ کے وجود کو بھی دنیا میں اسی طرح برداشت نہیں کر سکتا تھا جس طرح اس کے پہلے آپ کے والدِ بزرگوار کا رہنا اس نے گوارا نہیں کیا۔ مگر یا تو امام موسیٰ کاظمؑ کے ساتھ جو طویل مدت تک تشدد اور ظلم ہوتا رہا اور جس کے نتیجہ میں قید خانہ ہی کے اندر آپ دنیا سے رخصت ہو گئے اس سے حکومتِ وقت کی عام بدنامی ہو گئی تھی اور یا واقعی ظالم کو اپنی بدسلوکیوں کا احساس ہوا اور ضمیر کی طرف سے ملامت کی کیفیت

سی جس کی وجہ سے کھلم کھلا امام رضاؑ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ ایک دن یحییٰ ابنِ خالد برمکی نے اپنے اثر و رسوخ کے بڑھانے کے لیے یہ کہا بھی کہ علیؑ ابن موسیٰ بھی اب اپنے باپ کے بعد امامت کے اسی طرح دعویدار ہیں تو ہارون نے جواب دیا کہ جو کچھ ہم نے ان کے باپ کے ساتھ کیا وہی کیا کم ہے جو اب تم چاہتے ہو کہ میں اس نسل ہی کا خاتمہ کروں۔

پھر بھی ہارون رشید کا اہل بیتِ رسولؐ سے شدید اختلاف اور سادات کے ساتھ جو برتاؤ اب تک تھا اس کی بنا پر عام طور سے عمالِ حکومت یا عام افراد بھی جنھیں حکومت کو راضی رکھنے کی خواہش تھی اہل بیتؑ کے ساتھ کوئی اچھا رویّہ رکھنے پر تیار نہیں ہو سکتے تھے اور نہ امامؑ کے پاس آزادی کے ساتھ لوگ استفادہ کے لیے آسکتے تھے نہ حضرتؑ کو سچے اسلامی احکام کی اشاعت کے مواقع حاصل تھے۔

ہارون کا آخری زمانہ اپنے دونوں بیٹوں امین اور مامون کی باہمی رقابتوں سے بہت بے لطفی میں گزرا۔ امین پہلی بیوی سے تھا جو خاندان شاہی سے منصور دوانقی کی پوتی تھی اور اس لیے عرب سردار سب اس کے طرفدار تھے اور مامون ایک عجمی کنیز کے پیٹ میں سے تھا۔ اس لیے دربار کا عجمی طبقہ اس سے محبت کرتا تھا۔ دونوں کی آپس کی رسہ کشی ہارون کے لیے سوہانِ روح بنی رہتی تھی۔ اس نے اپنے خیال میں اس کا تصفیہ مملکت کی تقسیم کے ساتھ یوں کر دیا کہ دارالسلطنت بغداد اور اس کے چاروں طرف کے عربی حصے جیسے شام، مصر، حجاز، یمن وغیرہ محمد امین کے نام کیے گئے اور مشرقی ممالک جیسے ایران، خراسان، ترکستان وغیرہ مامون کے لیے مقرر کیے گئے۔ مگر یہ تصفیہ تو اس وقت کارگر ہو سکتا تھا جب دونوں فریق "جیو اور جینے دو" کے اصول پر عمل کرتے ہوتے۔

لیکن جہاں اقتدار کی ہوس کارفرما ہو وہاں اگر بنی عباس کے ہاتھوں بنی فاطمہؑ کے خلاف ہر طرح کے ظلم و تعدی کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے تو خود بنی عباس میں ایک گھر کے اندر دو بھائی اگر ایک دوسرے کے مدِ مقابل ہوں تو کیوں نہ ایک دوسرے کے

خلاف جارحانہ کاروائیاں کرنے پر تیار نظر آتے۔ اور کیوں نہ ان طاقتوں میں باہم تصادم ہو جب کہ ان میں سے کوئی اس ہمدردی اور ایثار اور خلقِ خدا کی خیرخواہی کا بھی حامل نہیں ہے جسے بنی فاطمہؑ اپنے پیشِ نظر رکھ کر اپنے واقعی حقوق سے چشم پوشی کر لیا کرتے تھے اسی کا نتیجہ تھا کہ ادھر ہارون کی آنکھ بند ہوئی اور ادھر بھائیوں میں خانہ جنگی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ آخر چار برس کی مسلسل کشمکش اور طویل خونریزی کے بعد مامون کو کامیابی ہوئی اور اس کا بھائی امین محرم ۱۹۸ھ میں تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا اور مامون کی خلافت تمام بنی عباس کے حدودِ سلطنت پر قائم ہو گئی۔

ولیعہدی

امین کے قتل ہونے کے بعد سلطنت تو مامون کے نام سے قائم ہو گئی مگر یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ امین ننھیال کی طرف سے عربی النسل تھا اور مامون عجمی النسل۔ امین کے قتل ہونے سے عراق کی عرب قوم اور ارکانِ سلطنت کے دل مامون کی طرف سے صاف نہیں ہو سکتے تھے بلکہ ایک غم و غصہ کی کیفیت محسوس کرتے تھے دوسری طرف خود بنی عباس میں سے ایک بڑی جماعت جو امین کی طرفدار تھی اس سے بھی مامون کو ہر وقت خطرہ لگا ہوا تھا۔ اولادِ فاطمہؑ میں سے بہت سے لوگ جو وقتاً فوقتاً بنی عباس کے مقابل میں کھڑے ہوتے رہتے تھے وہ خواہ قتل کر دیئے گئے ہوں یا جلاوطن کیے گیے ہوں یا قید رکھے گئے ہوں ان کے بھی موافق ایک جماعت تھی جو اگر حکومت کا کچھ بگاڑ نہ بھی سکتی تب بھی دل ہی دل میں حکومتِ بنی عباس سے بیزار ضرور تھی۔

ایران میں ابو مسلم خراسانی نے بنی امیہ کے خلاف جو اشتعال پیدا کیا تھا وہ ان مظالم ہی کو یاد دلا کر جو بنی امیہ کے ہاتھوں حضرت امام حسین علیہ السلام اور دوسرے بنی فاطمہؑ کے ساتھ ہوتے تھے اس سے ایران میں اس خاندان کے ساتھ ہمدردی کا پیدا ہونا فطری تھا۔ درمیان میں بنی عباس نے اس سے غلط فائدہ اٹھایا مگر اتنی مدت میں کچھ نہ کچھ تو ایرانیوں کی آنکھیں بھی کھلی ہی ہوں گی کہ ہم سے کیا کہا گیا تھا اور اقتدار

کن لوگوں نے حاصل کر لیا۔ ممکن ہے کہ ایرانی قوم کے ان رجحانات کا چرچا مامون کے کانوں تک بھی پہنچا ہو۔ اب جس وقت کہ امین کے قتل کے بعد وہ عرب قوم پر اور بنی عباس کے خاندان پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا اور اسے ہر وقت اس حلقہ سے بغاوت کا اندیشہ تھا تو اسے سیاسی مصلحت اسی میں معلوم ہوئی کہ عرب کے خلاف عجم اور بنی عباس کے خلاف بنی فاطمہؑ کو اپنا بنایا جائے اور چونکہ طرزِ عمل میں خلوص سمجھا نہیں جا سکتا اور وہ عالم طبائع پر اثر نہیں ڈال سکتا۔ اگر یہ نمایاں ہو جائے کہ وہ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ہے اس لیے ضرورت ہوئی کہ مامون مذہبی حیثیت سے اپنی شیعیت اور ولائے اہل بیتؑ کے چرچے عوام کے حلقوں میں پھیلائے اور یہ دکھلائے کہ وہ انتہائی نیک نیتی سے اب "حق بحق دار رسید" کے مقولے کو سچا بنانا چاہتا ہے۔

اس سلسلے میں جیسا کہ جناب شیخ صدوق اعلی اللہ مقامہ، نے تحریر فرمایا ہے اس نے اپنی نذر کی حکایت بھی نشر کی کہ جب امین کا اور میرا مقابلہ تھا اور بہت نازک حالت تھی اور عین اسی وقت میرے خلاف سیستان اور کرمان میں بھی بغاوت ہو گئی تھی اور خراسان میں بھی بے چینی پھیلی ہوئی تھی اور میری مالی حالت بھی ابتر تھی اور فوج کی طرف سے بھی اطمینان نہ تھا تو اس سخت اور دشوار ماحول میں میں نے خدا سے التجا کی اور منّت مانی کہ اگر یہ سب جھگڑے ختم ہو جائیں اور میں خلافت تک پہنچوں تو اس کو اس کے اصلی حقدار یعنی اولادِ فاطمہؑ میں سے جو اس کا اہل ہو اس تک پہنچا دوں گا۔ اسی نذر کے بعد سے میرے سب کام بننے لگے اور آخر تمام دشمنوں پر مجھے فتح حاصل ہوئی۔

یقیناً یہ واقعہ مامون کی طرف سے اس لیے بیان کیا گیا کہ اس کا طرزِ عمل خلوصِ قلب اور حسنِ نیّت پر مبنی سمجھا جائے۔ یوں تو اہلبیتؑ کے جو کھلے ہوئے سخت سے سخت دشمن تھے وہ بھی ان کی حقیقت اور فضیلت سے واقف تھے ہی اور ان کی عظمت کو جانتے تھے مگر شیعیت کے معنیٰ صرف یہ جاننا تو نہیں ہیں بلکہ محبت رکھنا اور اطاعت کرنا ہیں اور مامون کے طرزِ عمل سے یہ ظاہر ہے کہ وہ اس دعوائے شیعیت اور محبت اہلبیتؑ

کا ڈھنڈورہ پیٹنے کے باوجود خود امامؑ کی اطاعت نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ عوام کو اپنی منشاء کے مطابق چلانے کی کوشش کی تھی۔ ولی عہد بننے کے بارے میں آپ کے اختیارات کو بالکل سلب کر دیا گیا اور آپ کو مجبور بنا دیا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ولی عہدی کی تفویض بھی ایک حاکمانہ تشدد تھا جو اس وقت شیعیت کے بھیس میں امامؑ کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔

امام علیہ السلام کا اس ولیعہدی کو قبول کرنا بالکل ایسا ہی تھا جیسا ہارون کے حکم سے امام موسیٰ کاظمؑ کا جیل خانہ چلے جانا۔ اسی لیے جب امام رضا مدینہ منورہ سے خراسان کی طرف روانہ ہو رہے تھے تو آپ کے رنج و صدمہ اور اضطراب کی کوئی حد نہ تھی روضۂ رسولؐ سے رخصت کے وقت آپ کا وہی عالم تھا جو حضرت امام حسینؑ کا مدینہ سے روانگی کے موقع پر تھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آپ بیتابانہ روضہ کے اندر جاتے ہیں اور نالہ و آہ کے ساتھ امت کی شکایت کرتے ہیں۔ پھر باہر آتے نکل کر گھر جانے کا ارادہ کرتے ہیں اور پھر دل نہیں مانتا، پھر روضہ سے جا کر لپٹ جاتے ہیں۔ یہی صورت کئی مرتبہ ہوئی۔ راوی کا بیان ہے کہ میں حضرتؑ کے قریب گیا تو فرمایا اے محول میں اپنے جدِ امجدؐ کے روضہ سے بہ جبر جدا کیا جا رہا ہوں۔ اب مجھ کو یہاں واپس آنا نصیب نہ ہوگا۔

۲۰۰ھ میں حضرتؑ مدینہ منورہ سے خراسان کی طرف روانہ ہوئے۔ اہل و عیال اور متعلقین سب کو مدینہ ہی چھوڑ گئے۔ اس وقت امام محمد تقی علیہ السلام کی عمر پانچ برس کی تھی۔ آپ بھی مدینہ ہی میں رہے۔ جب حضرتؑ مرو پہنچے جو اس وقت دار السلطنت تھا تو مامون نے چند روز ضیافت و تکریم کے مراسم ادا کرنے کے بعد قبولِ خلافت کا سوال پیش کیا۔ حضرتؑ نے اس سے اسی طرح انکار کیا جس طرح امیر المومنینؑ چوتھے موقع پر خلافت پیش کیے جانے کے وقت انکار فرما رہے تھے۔ مامون کو خلافت سے دست بردار ہونا درحقیقت منظور نہ تھا ورنہ وہ امامؑ کو اسی پر مجبور کرتا۔ چنانچہ جب حضرتؑ نے خلافت قبول کرنے سے انکار فرمایا تو اس نے ولیعہدی کا سوال پیش

کیا۔ حضرتؑ اس کے بھی انجام سے واقف تھے۔ نیز بخوشی جابر حکومت کی طرف سے کوئی منصب قبول کرنا آپ کے مذہبی اصول کے خلاف تھا۔ حضرتؑ نے اس سے بھی انکار فرمایا مگر اس پر مامون کا اصرار جبر کی حد تک پہنچ گیا اور اس نے صاف کہدیا کہ اگر آپ اس کو منظور نہیں کر سکتے تو آپ کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ جان کا خطرہ قبول کیا جا سکتا ہے۔ جب مذہبی مفاد کا قیام جان دینے پر موقوف ہو ورنہ حفاظتِ جان شریعتِ اسلام کا بنیادی حکم ہے۔ امامؑ نے فرمایا یہ ہے تو مجبوراً قبول کرتا ہوں مگر کاروبارِ سلطنت میں میں خود دخل نہ دوں گا۔ ہاں اگر کسی بات میں مجھ سے مشورہ لیا جائے گا تو نیک مشورہ ضرور دوں گا۔ اس کے بعد یہ ولی عہدی صرف برائے نام سلطنتِ وقت کے ایک ڈھکوسلے سے زیادہ کوئی وقعت نہ رکھتی تھی۔ جس سے ممکن ہے کچھ عرصہ تک کسی سیاسی مقصد میں کامیابی حاصل کر لی گئی ہو۔ مگر امامؑ کی حیثیت اپنے فرائض کے انجام دینے میں بالکل وہ تھی جو ان کے پیش رو حضرت علی مرتضیٰؑ اپنے زمانہ کی با اقتدار طاقتوں کے ساتھ اختیار کر چکے تھے جس طرح ان کا کبھی کبھی مشورہ دے دینا ان حکومتوں کو صحیح اور جائز نہیں بنا سکتا تھا ویسے ہی امام رضاؑ کا اس نوعیت سے ولیعہدی کا قبول فرمانا اس سلطنت کے جواز کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف مامون کی ایک راج ہٹ تھی جو اس طرح پوری ہو گئی مگر امامؑ نے اپنے دامن کو سلطنتِ ظلم کے اقدامات اور نظم و نسق سے بالکل الگ رکھا۔

بنی عباس مامون کے اس فیصلے سے قطعاً متفق نہ تھے انھوں نے بہت کچھ دراندازیاں کیں مگر مامون نے صاف کہہ دیا کہ علی رضاؑ سے بہتر کوئی دوسرا شخص تم بتا دو اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس سلسلے میں بڑے بڑے مناظرے بھی ہوئے مگر ظاہر ہے کہ امامؑ کے مقابلہ میں کس کی علمی فوقیت ثابت ہو سکتی تھی۔ مامون کا فیصلہ اٹل تھا اور وہ اس سے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھا۔ نہ کوئی دوسرا دلائل سے اسے قائل کر سکتا تھا کہ وہ اپنے فیصلہ کو بدل دیتا۔

یکم رمضان ۲۰۱ھ روز پنجشنبہ جلسۂ ولی عہدی منعقد ہوا۔ بڑی شان شوکت اور تزک و

احتشام کے ساتھ یہ تقریب عمل میں لائی گئی۔ سب سے پہلے مامون نے اپنے بیٹے عباس کو اشارہ کیا اور اس نے بیعت کی۔ پھر اور لوگ بیعت سے شرفیاب ہوئے۔ سونے اور چاندی کے سکے سر مبارک پر نثار کیے گئے اور تمام ارکانِ سلطنت و ملازمین کو انعامات تقسیم ہوئے۔ مامون نے حکم دیا کہ حضرتؑ کے نام کا سکہ تیار کیا جائے۔ چنانچہ درہم و دینار پر حضرتؑ کے نام کا نقش ہوا اور تمام قلمرو میں وہ سکہ چلایا گیا۔ جمعہ کے خطبہ میں حضرتؑ کا نام داخل کیا گیا۔

اخلاق واوصاف

مجبوری اور بے بسی کا نام قناعت یا درویشی، عصمت بی بی از بے چادری" کے مقولہ کے موافق اکثر ابنائے دنیا کا شعار رہتا ہے مگر ثروت و اقتدار کے ساتھ فقیرانہ زندگی اختیار کرنا بلند مرتبہ مردانِ خدا کا حصہ ہے۔ اہل بیت معصومینؑ میں سے جو بزرگوار ظاہری حیثیت سے اقتدار کے درجہ پر نہ تھے کیونکہ ان کی فقیری کو دشمن بے بسی پر محمول کر کے طعن و تشنیع پر آمادہ ہوتے اور حقانیت کے وقار کو ٹھیس لگتی مگر جو بزرگ اتفاقاتِ روزگار سے ظاہری اقتدار کے درجہ پر پہنچ گئے۔ انہوں نے اتنا ہی فقر اور سادگی کے مظاہرہ میں اضافہ کر دیا تاکہ ان کی زندگی سے غریب مسلمانوں کی تسلی کا ذریعہ بنے اور ان کے لیے نمونۂ عمل ہو جیسے امیرالمومنین حضرت علی المرتضیٰؑ چونکہ شہنشاہِ اسلام مانے جارہے تھے اس لیے آپ کا لباس اور طعام ویسا زاہدانہ تھا جس کی مثال دوسرے معصومینؑ کے یہاں نہیں ملتی۔ یہی صورت حضرت علی رضاؑ کی تھی۔ آپ مسلمانوں کی اس عظیم الشان سلطنت کے ولی عہد بنائے گئے تھے جن کی وسعتِ مملکت کے سامنے روم و فارس کا ذکر بھی طاقِ نسیان کی نذر ہو گیا تھا۔ جہاں اگر بادل سامنے سے گزرتا تھا تو خلیفہ کی زبان سے آواز بلند ہوتی تھی کہ "جا جہاں تجھے برسنا ہو برس، بہر حال تیری پیداوار کا خراج میرے ہی پاس آئے گا"۔
حضرت امام رضاؑ کا اس سلطنت کی ولیعہدی پر فائز ہونا دنیا کے سامنے ایک نمونہ تھا

کہ دین والے اگر دنیا کو پا جائیں تو ان کا رویہ کیا ہوگا۔ یہاں امام رضاؑ کو اپنی دینی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے ضرورت تھی کہ زہد اور ترکِ دنیا کے مظاہرے اتنے ہی نمایاں تر بنا دیں جتنے تزک و احتشام کے دنیوی تقاضے زیادہ ہیں چنانچہ تاریخ نے اپنے کو دہرا دیا اور وہ علی رضاؑ کے لباس میں علی مرتضیٰؑ کی سیرت دنیا کی نگاہوں کے سامنے آگئی۔ آپ نے اپنی دولت سرا میں قیمتی قالین بچھوانا پسند نہیں کیے بلکہ جاڑے میں بالوں کا کمبل اور گرمی میں چٹائی کا فرش ہوا کرتا تھا۔ کھانا سامنے لایا جاتا تو دربان سائیس اور تمام غلاموں کو بلا کر اپنے ساتھ کھانے میں شریک فرماتے تھے۔ داب و آدابِ شاہی کے خوگر ایک بلخی شخص نے ایک دن کہہ دیا کہ حضور اگر ان لوگوں کے کھانے کا انتظام الگ ہو جایا کرے تو کیا ہرج ہے؟ حضرتؑ نے فرمایا۔ خالق سب کا اللہ ہے۔ ماں سب کی حواؑ اور باپ سب کے آدمؑ ہیں۔ جزا و سزا ہر ایک کی اس کے عمل کے مطابق ہوگی۔ پھر دنیا میں تفرقہ کس لیے ہو۔

اسی عباسی سلطنت کے ماحول کا ایک جز و بن کر جہاں صرف پیغمبرؐ کی طرف ایک قرابتداری کی نسبت کے سبب اپنے کو خلقِ خدا پر حکمرانی کا حقدار بنایا جاتا تھا اور اس کے ساتھ کبھی اپنے اعمال و افعال پر نظر نہ کی جاتی تھی کہ ہم کیسے ہیں اور ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ یہ کہا جانے لگا کہ بنی عباس ظلم و ستم اور فسق و فجور میں بنی امیہ سے کم نہ رہے بلکہ بعض باتوں میں ان سے آگے بڑھ گئے اور اس کے ساتھ پھر بھی قرابتِ رسولؐ پر افتخار تھا۔ اس ماحول کے اندر داخل ہو کر امام رضاؑ کا اس بات پر بڑا زور دینا کہ قرابت کوئی چیز نہیں اصل انسان کا عمل ہے بظاہر صرف ایک شخص کا اظہارِ فروتنی اور انکسارِ نفس تھا جو بہر حال ایک اچھی صفت ہے لیکن حقیقت میں وہ اس سے بڑھ کر تقریباً ایک صدی کی عباسی سلطنت کی پیدا کی ہوئی ذہنیت کے خلاف اسلامی نظریہ کا اعلان تھا اور اس حیثیت سے بڑا اہم ہو گیا تھا کہ وہ اب اسی سلطنت کے ایک رکن کی طرف سے ہو رہا تھا۔ چنانچہ امام رضاؑ کی سیرت میں اس کے مختلف شواہد ہیں۔ ایک شخص نے حضرتؑ کی خدمت میں عرض کی کہ "خدا کی قسم

آباؤاجداد کے اعتبار سے کوئی شخص آپ سے افضل نہیں"۔ حضرتؑ نے فرمایا "میرے آباؤاجداد کو جو شرف حاصل ہوا وہ صرف تقویٰ، پرہیزگاری اور اطاعتِ خدا سے"۔ ایک شخص نے کسی دن کہا کہ "واللہ آپ بہترین خلق ہیں" حضرتؑ نے فرمایا "اے شخص حلف نہ اٹھا، جس کا تقویٰ و پرہیزگاری مجھ سے زیادہ ہو وہ مجھ سے افضل ہے"۔

ابراہیم بن عباس کا بیان ہے کہ حضرتؑ فرماتے تھے "میرے تمام لونڈی اور غلام آزاد ہو جائیں اگر اس کے سوا کچھ اور ہو کہ میں اپنے کو محض رسول اللہؐ کی قرابت کی وجہ سے اس سیاہ رنگ غلام سے بھی افضل نہیں جانتا (حضرتؑ نے اشارہ کیا اپنے ایک غلام کی جانب) ہاں جب عملِ خیر بجا لاؤں تو اللہ کے نزدیک اس سے افضل ہوں گا"۔

یہ باتیں کوتاہ نظر لوگ صرف ذاتی انکسار پر محمول کر لیتے ہوں مگر خود حکومت عباسیہ کا فرماں روا یقیناً اتنا کند ذہن نہ ہوگا کہ وہ ان تازیانوں کو محسوس نہ کرے جو امام رضاؑ کے خاموش افعال اور اس طرح کے اقوال سے اس کے خاندانی نظام سلطنت پر برابر لگ رہے تھے۔ اس نے تو بخیالِ خود ایک وقتی سیاسی مصلحت سے اپنی سلطنت کو مستحکم بنانے کے لیے حضرتؑ کو ولی عہد بنایا تھا مگر بہت جلد اسے محسوس ہوا کہ اگر ان کی زندگی زیادہ عرصہ تک قائم رہی تو عوام کی ذہنیت میں یک لخت انقلاب ہو جائے گا اور عباسی سلطنت کا تخت ہمیشہ کے لیے الٹ جائے گا۔

عزائے حسینؑ کی اشاعت

اب امام رضاؑ کو تبلیغِ حق کے لیے نامِ حسینؑ کی اشاعت کے کام کو ترقی دینے کا بھی پورا موقع حاصل ہو گیا تھا۔ جس کی بنیاد اس کے پہلے حضرت امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ قائم کر چکے تھے مگر وہ زمانہ ایسا تھا کہ امامؑ کی خدمت میں وہی لوگ حاضر ہوتے تھے جو بحیثیت امامؑ اور بحیثیت عالم دین آپ کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے اور اب امام رضاؑ تو امام روحانی بھی ہیں اور ولی عہدِ سلطنت بھی۔ اس لیے آپ

کے دربار میں حاضر ہونے والوں کا دائرہ وسیع ہے۔ مرو کا مقام ہے جو ایران کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ ہر طرف کے لوگ یہاں آتے ہیں اور یہاں یہ عالم کہ ادھر محرم کا چاند نکلا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دوسروں کو بھی ترغیب وتحریص کی جانے لگی کہ آلِ محمدؐ کے مصائب کو یاد کرو اور تاثراتِ غم کو ظاہر کرو۔

یہ بھی ارشاد ہونے لگا کہ جو اس مجلس میں بیٹھے جہاں ہماری باتیں زندہ کی جاتی ہیں اس کا دل مردہ نہ ہوگا۔ اس دن کہ جب سب کے دل مردہ ہوں گے۔

تذکرہ امام حسین علیہ السلام کے لیے جو مجمع ہو اس کا نام اصطلاحی طور پر مجلسؔ۔ اسی امام رضاؑ کی حدیث ہی سے ماخوذ ہے۔ آپ نے عملی طور پر بھی خود مجلسیں کرنا شروع کر دیں۔ جن میں کبھی خود ذاکر ہوتے اور دوسرے سامعین جیسے ریان بن شبیب کی حاضری کے موقع پر جو آپ نے مصائب امام حسینؑ بیان فرمائے اور کبھی عبداللہ بن ثابت یا دعبل خزاعی ایسے کسی شاعر کی حاضری کے موقع پر اس شاعر کو حکم ہوا کہ تم ذکرِ امام حسینؑ میں اشعار پڑھو وہ ذاکر ہوا اور حضرتؑ سامعین میں داخل ہوئے۔

دعبلؔ کو حضرتؑ نے بعد مجلس ایک قیمتی حلّہ بھی مرحمت فرمایا جس کے لینے میں دعبل نے یہ کہہ کر عذر کیا کہ مجھے قیمتی حلّہ کی ضرورت نہیں ہے اپنے جسم کا اترا ہوا لباس مرحمت فرمائیے تو حضرت نے ان کی خوشی پوری کی وہ حلّہ تو انھیں دیا ہی تھا اس کے علاوہ ایک جبّہ اپنے پہننے کا بھی مرحمت فرمایا۔

اس سے ذاکر کا بلند طریقہ کار کہ اسے کسی دنیوی انعام کی خاطر یا معاذاللہ اجرت طے کر کے ذاکری نہیں کرنا چاہیے اور بانی مجلس کا طریقہ کار کہ وہ بغیر طے کیے ہوئے کچھ بطور پیشکش ذاکر کی خدمت میں پیش کرے دونوں امر ثابت ہیں مگر ان مجالس میں سامعین کے اندر کسی حصہ کی تقسیم ہرگز کسی معتبر کتاب سے ثابت نہیں ہوئی۔

وفات

مامون کی توقعات غلط ثابت ہونے ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ آخر امامؑ کی جان لینے کے

درپے ہوگیا اور وہی خاموش حربہ جو ان معصومینؑ کے ساتھ اس کے پہلے بہت دفعہ استعمال کیا جا چکا تھا کام میں لایا گیا۔ انگور میں جو بطور تحفہ امامؑ کے سامنے پیش کیے گئے تھے زہر دیا گیا اور اس کے اثر سے ۱۷ صفر ۲۰۳ھ میں حضرتؑ نے شہادت پائی۔ مامون نے بظاہر بہت رنج و ماتم کا اظہار کیا اور بڑے شان و شکوہ کے ساتھ اپنے باپ ہارون رشید کے قریب دفن کیا۔ جہاں مشہد مقدس میں حضرتؑ کا روضہ آج تاجدارانِ عالم کی جبیں سائی کا مرکز بنا ہوا ہے وہیں اپنے وقت کا بزرگ ترین دنیوی شہنشاہ ہارون رشید بھی دفن ہے جس کا نام و نشان تک وہاں جانے والوں کو معلوم نہیں ہوتا۔

MAAB 1431
مرکز احیاء آثار برصغیر
maablib.org

مرکز احیاء آثار برّ صغیر
MAAB 1431
maablib.org

نویں امام

حضرت محمد تقی علیہ السلام

نام و نسب

محمدؑ نام، ابو جعفرؑ کنیت اور تقیؑ و جوادؑ دونوں مشہور لقب تھے۔ اسی لیے اسم و لقب کو شریک کر کے آپ امام محمد تقی علیہ السلام کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ چونکہ آپ کے پہلے امام محمد باقر علیہ السلام کی کنیت ابو جعفر ہو چکی تھی اس لیے کتابوں میں آپ کو ابو جعفر ثانی اور دوسرے لقب کو سامنے رکھ کر حضرت جوّاد بھی کہا جاتا ہے۔ والد بزرگوار آپ کے حضرت امام رضاؑ تھے اور والدہ معظمہ کا نام جناب سبیکہ یا سکینہؑ تھا۔

ولادت

۱۰ رجب ۱۹۵ھ کو مدینہ منورہ میں ولادت ہوئی۔ اس وقت بغداد کے دارالسلطنت میں ہارون رشید کا بیٹا امین تخت حکومت پر تھا۔

maablib.org

نشو و نما اور تربیت

یہ ایک حسرتناک واقعہ ہے کہ امام محمد تقی علیہ السلام کو نہایت کمسنی ہی کے زمانے میں مصائب اور پریشانیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جانا پڑا۔ انھیں بہت ہی کم اطمینان اور سکون کے لمحات میں باپ کی محبت، شفقت اور تربیت کے سائے میں زندگی گزارنے کا موقع مل سکا۔ آپ کو صرف پانچواں برس تھا جب حضرت امام رضاؑ

مدینہ سے خراسان کی طرف سفر کرنے پر مجبور ہوئے تو پھر زندگی میں ملاقات کا موقع نہ ملا امام محمد تقیؑ سے جدا ہونے کے تیسرے سال امام رضاؑ کی وفات ہو گئی۔ دنیا سمجھتی ہو گی کہ امام محمد تقیؑ کے لیے علمی و عملی بلندیوں تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہا اس لیے اب امام جعفر صادقؑ کی علمی مسند شاید خالی نظر آئے مگر خلقِ خدا کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس کمسن بچے کو تھوڑے دن بعد مامون کے پہلو میں بیٹھ کر بڑے بڑے علماء سے فقہ، حدیث، تفسیر اور کلام پر مناظرے کرتے اور سب کو قائل ہو جاتے دیکھا۔ ان کی حیرت اس وقت تک دور ہونا ممکن نہ تھی، جب تک وہ مادی اسباب کے آگے ایک مخصوص خداوندی مدرسہ تعلیم و تربیت کے قائل نہ ہوتے، جس کے بغیر یہ معمہ نہ حل ہوا اور نہ کبھی حل ہو سکتا ہے۔

عراق کا پہلا سفر

جب امام رضا علیہ السلام کو مامون نے ولی عہد بنایا اور اس کی سیاست اس کی مقتضی ہوئی کہ بنی عباس کو چھوڑ کر بنی فاطمہؑ سے روابط قائم کیے جائیں اور اس طرح شیعیانِ اہل بیتؑ کو اپنی جانب مائل کیا جائے تو اس نے ضرورت محسوس کی کہ خلوص و اتحاد کے مظاہرے کے لیے علاوہ اس قدیم رشتے کے جو ہاشمی خاندان میں سے ہونے کی وجہ سے ہے، کچھ جدید رشتوں کی بنیاد بھی قائم کر دی جائے چنانچہ اسی جلسہ میں جہاں ولی عہدی کی رسم ادا کی گئی۔ اس نے اپنی بہن ام حبیبہ کا عقد امام رضاؑ کے ساتھ کیا اور اپنی بیٹی ام الفضل کی نسبت کا امام محمد تقیؑ کے ساتھ اعلان کیا۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ اس طرح امام رضاؑ بالکل اپنے بنائے جا سکیں گے مگر جب اس نے محسوس کیا کہ یہ اپنے ان منصبی فرائض کو جو رسولؐ کے ورثہ دار ہونے کی بنا پر ان کے ذمہ ہیں۔ کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے اور اب عباسی سلطنت کا رکن ہونے کے ساتھ ان اصول پر قائم رہنا۔ مدینہ کے محلہ بنی ہاشم میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ تو اسے

اپنے مفاد سلطنت کے تحفظ کی خاطر اس کی ضرورت ہوئی کہ وہ زہر دے کر حضرتؑ کی زندگی کا خاتمہ کردے مگر وہ مصلحت جو امام رضاؑ کو ولی عہد بنانے کی تھی یعنی ایرانی قوم اور جماعتِ شیعہ کو اپنے قبضے میں رکھنا وہ اب بھی باقی تھی اس لیے ایک طرف تو امام رضاؑ کے انتقال پر اس نے غیر معمولی رنج و غم کا اظہار کیا تاکہ وہ اپنے دامن کو حضرتؑ کے خونِ ناحق سے الگ ثابت کر سکے۔ اور دوسری طرف اس نے اپنے اس اعلان کی تکمیل ضروری سمجھی جو وہ امام محمد تقیؑ کے ساتھ اپنی لڑکی سے منسوب کرنے کا کر چکا تھا اس نے اس مقصد سے امام محمد تقیؑ کو مدینہ سے عراق کی طرف بلوایا۔ اس لیے کہ امام رضاؑ کی وفات کے بعد وہ خود خراسان سے اب اپنے خاندان کے پرانے دارالسلطنت بغداد میں آچکا تھا اور اس نے یہ تہیہ کرلیا کہ وہ ام الفضل کا عقد اس صاحبزادے کے ساتھ بہت جلد کردے۔

علمائے سے مناظرہ

بنی عباس کو مامون کی طرف سے امام رضاؑ کا ولیعہد بنایا جانا ہی ناقابل برداشت تھا۔ امام رضاؑ کی وفات سے ایک حد تک انھیں اطمینان حاصل ہوا تھا اور انھوں نے مامون سے اپنے حسبِ دلخواہ اس کے بھائی موتمن کی ولیعہدی کا اعلان بھی کرادیا جو بعد میں معتصم باللہ کے نام سے خلیفہ تسلیم کیا گیا۔ اس کے علاوہ امام رضاؑ کی ولیعہدی کے زمانہ میں عباسیوں کا مخصوص شعار یعنی کالا لباس ترک ہو کر جو سبز لباس کا رواج ہو رہا تھا اسے منسوخ کر کے پھر سیاہ لباس کی پابندی عائد کر دی گئی۔ تاکہ بنی عباس کے روایاتِ قدیمہ محفوظ رہیں۔ یہ سب باتیں عباسیوں کو یقین دلا رہی تھیں کہ وہ مامون پر پورا قابو پا چکے ہیں مگر اب مامون کا یہ ارادہ کہ وہ امام محمد تقیؑ کو اپنا داماد بنائے ان لوگوں کے لیے پھر تشویش کا باعث بنا۔ اس حد تک کہ وہ اپنے دلی رجحان کو دل میں نہ رکھ سکے اور ایک وفد کی شکل میں مامون کے پاس آکر اپنے جذبات کا اظہار کر دیا۔ انھوں نے صاف صاف کہا کہ امام رضاؑ کے ساتھ جو آپ نے طریقہ کار استعمال کیا وہی ہم کو ناپسند تھا۔ مگر خیر وہ کم از کم اپنی عمر اور اوصاف و کمالات کے لحاظ سے

قابلِ عزت سمجھے بھی جا سکتے تھے مگر یہ ان کے بیٹے محمدؑ تو ابھی بالکل کم سن ہیں ایک بچے کو بڑے بڑے علماء اور معززین پر ترجیح دینا اور اس قدر اس کی عزت کرنا ہرگز خلیفہ کے لیے زیبا نہیں ہے پھر ام حبیبہ کا نکاح جو امام رضاؑ کے ساتھ کیا گیا تھا اس سے ہم کو کیا فائدہ پہنچا. جواب ام الفضل کا نکاح محمد ابن علیؑ کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔

مامون نے اس تمام تقریر کا یہ جواب دیا کہ محمدؑ کمسن ضرور ہیں مگر میں نے خوب اندازہ کر لیا ہے۔ اوصاف و کمالات میں وہ اپنے باپ کے پورے جانشین ہیں اور عالمِ اسلام کے بڑے بڑے علماؑ جن کا تم حوالہ دے رہے ہو علم میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر تم چاہو تو امتحان لے کر دیکھ لو۔ پھر تمہیں بھی میرے فیصلے سے متفق ہونا پڑے گا۔ یہ صرف منصفانہ جواب ہی نہیں بلکہ ایک طرح کا یہ چیلنج تھا جس پر مجبوراً ان لوگوں کو مناظرے کی دعوت منظور کرنا پڑی حالانکہ خود مامون تمام سلاطینِ بنی عباس میں یہ خصوصیت رکھتا ہے کہ مورخین اس کے لیے یہ الفاظ لکھ دیتے ہیں۔ کان بعد من کبار الفقھاء یعنی اس کا شمار بڑے فقیہوں میں ہے۔ اس لیے اس کا فیصلہ خود کچھ کم وقعت نہ رکھتا تھا مگر ان لوگوں نے اس پر اکتفا نہیں کی بلکہ بغداد کے سب سے بڑے عالم یحییٰ بن اکثم کو امام محمد تقی علیہ السلام سے بحث کے لیے منتخب کیا۔

مامون نے ایک عظیم الشان جلسہ اس مناظرے کے لیے منعقد کیا اور عام اعلان کرا دیا۔ ہر شخص اس عجیب اور بظاہر غیر متوازی مقابلے کے دیکھنے کا مشتاق ہو گیا جس میں ایک طرف ایک آٹھ برس کا بچہ تھا اور دوسری طرف ایک آزمودہ کار اور شہرۂ آفاق قاضی القضاۃ۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہر طرف سے خلائق کا ہجوم ہو گیا۔ مورخین کا بیان ہے کہ ارکانِ دولت اور معززین کے علاوہ اس جلسے میں نو سو کرسیاں فقط علماؑ و فضلاؑ کے لیے مخصوص تھیں اور اس میں کوئی تعجب نہیں اس لیے کہ یہ زمانہ عباسی سلطنت کے شباب اور بالخصوص علمی ترقی کے اعتبار سے زریں دور تھا اور بغداد دار السلطنت تھا۔ جہاں تمام اطراف سے مختلف علوم و فنون کے ماہرین کھنچ کر جمع ہو گئے تھے۔ اس اعتبار سے یہ تعداد کسی مبالغہ پر مبنی معلوم نہیں ہوتی۔

مامون نے حضرت امام محمد تقیؑ کے لیے اپنے پہلو میں مسند بچھوائی تھی اور حضرتؑ کے سامنے یحییٰ ابن اکثم کے لیے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ ہر طرف کامل سناٹا تھا۔ مجمع ہمہ تن چشم و گوش بنا ہوا گفتگو شروع ہونے کے وقت کا منتظر ہی تھا کہ اس خاموشی کو یحییٰ کے اس سوال نے توڑ دیا جو اس نے مامون کی طرف مخاطب ہو کر کہا تھا: "حضور! کیا مجھے اجازت ہے کہ میں ابوجعفرؑ سے کوئی مسئلہ دریافت کروں؟

مامون نے کہا "تم کو خود ان ہی سے اجازت طلب کرنا چاہیے"۔

یحییٰ امامؑ کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: "کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ میں آپ سے کچھ دریافت کروں؟"

فرمایا: "تم جو پوچھنا چاہو پوچھ سکتے ہو"۔

یحییٰ نے پوچھا کہ "حالتِ احرام میں اگر کوئی شخص شکار کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟"

اس سوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ یحییٰ حضرت امام محمد تقیؑ کی علمی بلندی سے بالکل واقف نہ تھا۔ وہ اپنے غرورِ علم اور جہالت سے یہ سمجھتا تھا کہ یہ کمسن صاحبزادے تو ہیں ہی۔ روزمرہ کے روزے نماز کے مسائل سے واقف ہوں تو ہوں مگر حج وغیرہ کے احکام اور حالتِ احرام میں جن چیزوں کی ممانعت ہے ان کے کفاروں سے بھلا کہاں واقف ہوں گے۔

امامؑ نے اس کے جواب میں اس طرح سوال کے گوشوں کی الگ الگ تحلیل فرمائی جس سے بغیر کوئی جواب اصل مسئلے کا دیتے ہوئے آپ کے علم کی گہرائیوں کا یحییٰ اور تمام اہل محفل کو اندازہ ہو گیا۔ یحییٰ خود بھی اپنے کو سبک پانے لگا اور تمام مجمع بھی اس کا سبک ہونا محسوس کرنے لگا۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ تمہارا سوال بالکل مبہم اور مہمل ہے۔ یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ شکار حل میں تھا یا حرم میں شکار کرنے والا مسئلے سے واقف تھا یا ناواقف۔ اس نے عمداً اس جانور کو مار ڈالا یا دھوکے سے قتل ہو گیا۔ وہ شخص آزاد تھا یا غلام کمسن تھا یا بالغ پہلی مرتبہ ایسا کیا تھا یا اس کے پہلے بھی ایسا کر چکا تھا؟ شکار پرند کا تھا یا کوئی اور؟ چھوٹا یا بڑا؟ وہ اپنے فعل پر اصرار رکھتا ہے یا پشیمان ہے؟ رات کو یا پوشیدہ طریقہ پر اس نے شکار کیا یا دن دہاڑے اور علانیہ؟

احرام عمرہ کا تھا یا حج کا؟ جب تک یہ تمام تفصیلات نہ بتا دی جائیں اس مسئلہ کا کوئی ایک معین حکم نہیں بتایا جا سکتا۔

یحییٰ کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہوتا بہر حال فقہی مسائل پر کچھ نہ کچھ اس کی نظر بھی تھی۔ وہ ان کثیر التعداد شقوں کے پیدا کرنے ہی سے خوب سمجھ گیا کہ ان کا مقابلہ میرے لیے آسان نہیں ہے۔ اس کے چہرے پر ایسی شکستگی کے آثار پیدا ہوئے جن کا تمام دیکھنے والوں نے اندازہ کر لیا۔ اب اس کی زبان خاموش تھی اور وہ کچھ جواب نہ دیتا تھا۔ مامون نے اس کی کیفیت کا صحیح اندازہ کر کے اس سے کچھ کہنا بیکار سمجھا اور حضرتؑ سے عرض کیا کہ پھر آپ ہی ان تمام شقوں کے احکام بیان فرما دیجیے تاکہ سب کو استفادہ کا موقع مل سکے۔ امامؑ نے تفصیل کے ساتھ تمام صورتوں کے جداگانہ جو احکام تھے بیان فرماتے یحییٰ ہکا بکا امامؑ کا منہ دیکھ رہا تھا اور بالکل خاموش تھا۔ مامون کو بھی کد تھی کہ وہ اتمام حجت کو انتہائی درجے تک پہنچا دے اس لئے اس نے امامؑ سے عرض کیا کہ اگر مناسب معلوم ہو تو آپؑ بھی یحییٰ سے کوئی سوال فرمائیں۔ حضرتؑ نے اخلاقاً یحییٰ سے دریافت کیا کہ "کیا میں بھی تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟" یہ یحییٰ اب اپنے متعلق کسی دھوکے میں مبتلا نہ تھا، اپنا اور امامؑ کا درجہ اسے خوب معلوم ہو چکا تھا۔ اس لیے طرزِ گفتگو اس کا اب دوسرا ہی تھا۔ اس نے کہا کہ حضورؑ دریافت فرمائیں اگر مجھے معلوم ہو گا تو عرض کر دوں گا ورنہ خود حضورؑ ہی سے معلوم کر لوں گا۔ حضرتؑ نے سوال کیا۔ جس کے جواب میں یحییٰ نے کھلے لفظوں میں اپنی عاجزی کا اقرار کیا اور پھر امامؑ نے خود اس سوال کا حل فرما دیا۔ مامون کو اپنی بات کے بالا رہنے کی خوشی تھی۔ اس نے مجمع کی طرف مخاطب ہو کر کہا:۔

دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ یہ وہ گھرانا ہے جو قدرت کی طرف سے علم کا مالک قرار دیا گیا ہے۔ یہاں کے بچوں کا بھی کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مجمع میں جوش و خروش تھا۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ بے شک جو آپ کی رائے ہے وہ بالکل ٹھیک ہے اور یقیناً ابو جعفر محمد ابن علیؑ کا کوئی مثل نہیں ہے۔ مامون نے اس کے بعد ذرا بھی تاخیر

مناسب نہیں سمجھی اور اسی جلسے میں امام محمد تقی علیہ السلام کے ساتھ ام الفضل کا عقد کردیا۔ نکاح کے قبل جو خطبہ ہمارے یہاں عموماً پڑھا جاتا ہے وہی ہے جو کہ امام محمد تقیؑ نے اس عقد کے موقع پر اپنی زبان مبارک پر جاری کیا تھا۔ یہی بطور یادگار نکاح کے موقع پر باقی رکھا گیا ہے۔ مامون نے اس شادی کی خوشی میں بڑی فیاضی سے کام لیا۔ لاکھوں روپیہ خیر و خیرات میں تقسیم کیا گیا اور تمام رعایا کو انعامات و عطیات کے ساتھ مالا مال کیا گیا۔

مدینہ کی طرف واپسی

شادی کے بعد تقریباً ایک سال تک بغداد میں مقیم رہے اس کے بعد مامون نے بہت اہتمام کے ساتھ ام الفضل کو حضرتؑ کے ساتھ رخصت کردیا اور امامؑ مدینہ میں واپس تشریف لائے۔

اخلاق و اوصاف

امام محمد تقیؑ اخلاق و اوصاف میں انسانیت کی اس بلندی پر تھے جس کی تکمیل رسولؐ اور آل رسولؐ کا طرۂ امتیاز تھی ہر ایک سے جھک کر ملنا۔ ضرورت مندوں کی حاجت روائی کرنا مساوات اور سادگی کو ہر حالت میں پیش نظر رکھنا۔ غرباء کی پوشیدہ طور پر خبر لینا اور دوستوں کے علاوہ دشمنوں تک سے اچھا سلوک کرتے رہنا۔ مہمانوں کی خاطرداری میں انہماک اور علمی اور مذہبی پیاسوں کے لیے فیض کے چشموں کا جاری رکھنا آپ کی سیرت زندگی کا نمایاں پہلو تھا۔ بالکل ویسا ہی جیسے اس سلسلۂ عصمت کے دوسرے افراد کا تھا جن کے حالات اس سے پہلے لکھے جا چکے ہیں۔

اہل دنیا کو جو آپ کے بلندی نفس کا پورا اندازہ نہ رکھتے تھے انھیں یہ تصور ضرور ہوتا تھا کہ ایک کمسن بچے کا عظیم الشان مسلمان سلطنت کے شہنشاہ کا داماد ہو جانا یقیناً اس کے چال ڈھال طور طریقے کو بدل دے گا اور اس کی زندگی دوسرے سانچے میں ڈھل

جائے گی۔ حقیقت میں یہ ایک بہت بڑا مقصد ہو سکتا ہے جو مامون کی کوتاہ نگاہ کے سامنے بھی تھا۔ بنی امیہ یا بنی عباس کے بادشاہوں کو آلِ رسولؐ کی ذات سے اتنا اختلاف نہ تھا۔ جتنا ان کے صفات سے وہ ہمیشہ اس کے درپے رہتے تھے کہ بلندئ اخلاق اور معراجِ انسانیت کا وہ مرکز جو مدینہ میں قائم ہے اور جو سلطنت کے مادی اقتدار کے مقابلے میں ایک مثالی روحانیت کا مرکز بنا ہوا ہے۔ یہ کسی طرح ٹوٹ جائے۔ اسی کے لیے گھبرا گھبرا کر وہ مختلف تدبیریں کرتے تھے۔ امام حسینؑ سے بیعت طلب کرنا اسی کی ایک شکل تھی اور پھر امام رضاؑ کو ولی عہد بنانا اسی کا دوسرا طریقہ، فقط ظاہری شکل وصورت میں ایک کا انداز معاندانہ اور دوسرے کا طریقہ ارادت مندی کے روپ میں تھا مگر اصل حقیقت دونوں صورتوں میں ایک تھی۔ جس طرح امام حسینؑ نے بیعت نہ کی تو وہ شہید کر ڈالے گئے۔ اسی طرح امام رضاؑ ولی عہد ہونے کے باوجود حکومت کے مادی مقاصد کے ساتھ ساتھ نہ چل سکے تو آپ کو زہر کے ذریعے سے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا گیا۔

اب مامون کے نقطہ نظر سے یہ موقع انتہائی قیمتی تھا کہ امام رضاؑ کا جانشین تقریباً آٹھ برس کا بچہ ہے جو تین برس پہلے ہی باپ سے چھڑا لیا جا چکا تھا۔ حکومت وقت کی سیاسی سوجھ بوجھ کہہ رہی تھی کہ اس بچے کو اپنے طریقے پر لانا نہایت آسان ہے اور اس کے بعد وہ مرکز جو حکومتِ وقت کے خلاف ساکن اور خاموش مگر انتہائی خطرناک قائم ہے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔

مامون امام رضاؑ کی ولی عہدی کی مہم میں اپنی ناکامی کو مایوسی کا سبب نہیں تصور کرتا تھا۔ اس لیے کہ امام رضاؑ کی زندگی ایک اصول پر قائم رہ چکی تھی۔ اس میں تبدیلی اگر نہیں ہوتی تو یہ ضروری نہیں کہ امام محمد تقیؑ جو آٹھ برس کے سن میں قصرِ حکومت میں نشو و نما پا کر بڑھیں وہ بھی بالکل اپنے بزرگوں کے اصول زندگی پر برقرار رہیں۔

سوائے ان لوگوں کے جو ان مخصوص افراد کے خداداد کمالات کو جانتے تھے۔ اس وقت کا ہر شخص یقیناً مامون ہی کا ہم خیال ہوگا۔ مگر دنیا کو حیرت ہوگئی جب یہ دیکھا

کہ وہ آٹھ برس کا بچہ جسے شہنشاہِ اسلام کا داماد بنایا گیا ہے اس عمر میں اپنے خاندانی رکھ رکھاؤ اور اصول کا اتنا پابند ہے کہ وہ شادی کے بعد محل شاہی میں قیام سے انکار کر دیتا ہے اور اس وقت بھی کہ جب بغداد میں قیام رہتا تو ایک علیحدہ مکان کرایہ پر لے کر اس میں قیام فرماتے ہیں۔ اس سے بھی امامؑ کی مستحکم قوتِ ارادی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ عموماً مالی اعتبار سے لڑکی والے کچھ بھی بڑا درجہ رکھتے ہوتے ہیں تو وہ یہ پسند کرتے ہیں کہ جہاں وہ رہیں وہیں داماد بھی رہے۔ اس گھر میں نہ سہی تو کم از کم اسی شہر میں اس کا قیام رہے۔ مگر امام محمد تقیؑ نے شادی کے ایک سال بعد ہی مامون کو حجاز واپس جانے کی اجازت دینے پر مجبور کر دیا۔ یقیناً یہ امر ایک چاہنے والے باپ اور مامون ایسے با اقتدار کے لیے انتہائی ناگوار تھا مگر اسے لڑکی کی جدائی گوارا کرنا پڑی اور امامؑ مع ام الفضل کے مدینہ تشریف لے گئے۔

مدینہ میں تشریف لانے کے بعد ڈیوڑھی کا وہی انداز رہا جو اس کے پہلے تھا۔ نہ پہریدار نہ کوئی خاص روک ٹوک، نہ تزک و احتشام نہ اوقاتِ ملاقات نہ ملاقاتیوں کے ساتھ برتاؤں میں کوئی تفریق۔ زیادہ تر نشست مسجدِ نبوی میں رہتی تھی جہاں مسلمان ان حضرات ان کے وعظ و نصیحت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ راویانِ حدیث دریافت کرتے تھے۔ طالبِ علم مسائل پوچھتے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ جعفر صادقؑ ہی کا جانشین ہے جو اسی مسند علم پر بیٹھا ہوا ہدایت کا کام انجام دے رہا ہے۔

امورِ خانہ داری اور ازدواجی زندگی میں آپ کے بزرگوں نے اپنی بیویوں کو جن حدود میں رکھا تھا ان ہی حدود میں آپ نے ام الفضل کو بھی رکھا۔ آپ نے اس کی مطلق پروا نہیں کی کہ آپ کی بیوی ایک شہنشاہِ وقت کی بیٹی ہیں۔ چنانچہ ام الفضل کے ہوتے آپ نے حضرت عمار یاسرؓ کی نسل سے ایک محترم خاتون کے ساتھ عقد بھی فرمایا اور قدرت کو نسلِ امامت اسی خاتون سے باقی رکھنا منظور تھی۔ یہی امام علی نقیؑ کی ماں ہوئیں۔ ام الفضل نے اس کی شکایت اپنے باپ کے پاس لکھ کر بھیجی۔ مامون کے دل کے لیے بھی یہ کچھ کم تکلیف دہ امر نہ تھا۔ مگر اسے اب اپنے کیے کو نباہنا تھا۔ اس

نے ام الفضل کو جواب لکھا کہ میں نے تمہارا عقد ابو جعفرؑ کے ساتھ اس لیے نہیں کیا ہے کہ ان پر کسی حلالِ خدا کو حرام کر دوں۔ مجھ سے اب اس قسم کی شکایت نہ کرنا۔

جواب دے کر حقیقت میں اس نے اپنی خفت مٹائی ہے۔ ہمارے سامنے اس کی نظیریں موجود ہیں کہ اگر مذہبی حیثیت سے کوئی با احترام خاتون ہوئی ہے تو اس کی زندگی میں کسی دوسری بیوی سے نکاح نہیں کیا گیا جیسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے جناب خدیجۃؑ الکبریٰ اور حضرت علی مرتضیٰؑ کے لیے جناب فاطمہ زہراؑ مگر شہنشاہِ دنیا کی بیٹی کو یہ امتیاز دینا صرف اس لیے کہ وہ ایک بادشاہ کی بیٹی ہے۔ اسلام کی اس روح کے خلاف تھا جس کے آلِ محمدؐ محافظ تھے اس لیے امام محمد تقیؑ نے اس کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرنا اپنا فریضہ سمجھا۔

تبلیغ و ہدایت

آپ کی تقریر بہت دلکش اور پُرتاثیر ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ زمانہ حج میں مکہ معظمہ میں مسلمانوں کے مجمع میں کھڑے ہو کر آپ نے احکام شرعیؑ کی تبلیغ فرمائی تو بڑے بڑے علماء دم بخود اور دنگ رہ گئے اور انھیں اقرار کرنا پڑا کہ ہم نے ایسی جامع تقریر کبھی نہیں سنی۔ امام رضاؑ کے زمانہ میں ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جو امام موسیٰؑ کاظمؑ پر توقف کرتا تھا۔ یعنی آپ کے بعد امام رضا علیہ السلام کی امامت کا قائل نہیں تھا اور اسی لیے واقفیہ کہلاتا تھا۔ امام محمد تقیؑ نے اپنے دور میں اس گروہ میں ایسی کامیاب تبلیغ فرمائی کہ سب اپنے عقیدے سے تائب ہو گئے اور آپ کے زمانہ ہی میں کوئی ایک شخص ایسا باقی نہ رہ گیا جو اس مسلک کا حامی ہو۔

بہت سے بزرگ مرتبہ علمائے آپ سے علوم اہل بیتؑ کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کے ایسے مختصر حکیمانہ مقولوں کا بھی ایک ذخیرہ ہے جیسے آپ کے جدِ بزرگوار حضرت امیر المومنین علیؑ بن ابی طالبؑ کے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ جناب امیر علیہ السلام کے بعد امام محمد تقیؑ کے مقولوں کو ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ الٰہیات اور توحید

کے متعلق آپ کے بعض بلند پایہ خطبے بھی موجود ہیں۔

عراق کا آخری سفر

۲۱۸ھ میں مامون نے دنیا کو خیر باد کہا۔ اب مامون کا بھائی اور ام الفضل کا چچا موتمن جو امام رضاؑ کے بعد ولی عہد بنایا جا چکا تھا تختِ سلطنت پر بیٹھا اور معتصم باللہ عباسی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے بیٹھتے ہی امام محمد تقیؑ سے متعلق ام الفضل کے اسی طرح کے شکایتی خطوط کی رفتار بڑھ گئی۔ جس طرح کہ اس نے اپنے باپ مامون کو بھیجے تھے۔ مامون نے چونکہ تمام بنی عباس کی مخالفتوں کے بعد بھی اپنی لڑکی کا نکاح امام محمد تقیؑ کے ساتھ کر دیا تھا اس لیے اپنی بات کی پیچ اور کیے کی لاج رکھنے کی خاطر اس نے ان شکایتوں پر کوئی خاص توجہ نہیں کی بلکہ مایوس کر دینے والے جواب سے بیٹی کی زبان بند کر دی تھی مگر معتصم کو جو امام رضاؑ کی ولی عہدی کا داغ اپنے سینہ پر اٹھائے ہوئے تھا اور امام محمد تقیؑ کو داماد بنائے جانے سے تمام بنی عباس کے نمائندے کی حیثیت سے پہلے ہی اختلاف کرنے والوں میں پیش پیش رہ چکا تھا۔ اب ام الفضل کے شکایتی خطوں کو اہمیت دے کر اپنے اس اختلاف کو جو اس نکاح سے تھا۔ حق بجانب ثابت کرنا تھا۔ پھر سب سے زیادہ امام محمد تقیؑ کی علمی مرجعیت آپ کے اخلاقی اثر کا شہرہ جو حجاز سے بڑھ کر عراق تک پہنچا ہوا تھا وہ بنائے مخاصمت جو معتصم کے بزرگوں کو امام محمد تقیؑ کے بزرگوں سے رہ چکی تھی اور پھر اس سیاست کی ناکامی اور منصوبے کی شکست کا محسوس ہو جانا جو اس عقد کا محرک ہوا تھا جس کی تشریح پہلے ہو چکی ہے یہ تمام باتیں تھیں کہ معتصم مخالفت کے لیے آمادہ ہو گیا۔ اپنی سلطنت کے دوسرے ہی سال امام محمد تقیؑ کو مدینہ سے بغداد کی طرف بلوا بھیجا۔ حاکمِ مدینہ عبدالملک کو اس بارے میں تاکیدی خط لکھا۔ مجبوراً امام محمد تقیؑ اپنے فرزند امام علی نقیؑ اور ان کی والدہ کو مدینہ میں چھوڑ کر بغداد کی طرف روانہ ہوتے۔

وفات

بغداد میں تشریف لانے کے بعد تقریباً ایک سال تک معتصم نے بظاہر آپ کے ساتھ کوئی سختی نہیں کی مگر آپ کا یہاں کا قیام خود ہی ایک جبری حیثیت رکھتا تھا جسے نظر بندی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے اس کے بعد اسی خاموش حربے سے جو اکثر اس خاندان کے بزرگوں کے خلاف استعمال کیا جا چکا تھا آپ کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا اور ۲۹ ذی القعدہ ۲۲۰ھ میں زہر سے آپ کی شہادت ہوئی اور آپ نے جدِ بزرگوار حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے پاس دفن ہوئے۔ آپ ہی کی شرکت کا لحاظ کر کے عربی کے قاعدے سے اس شہر کا نام کاظمین (دو کاظم یعنی غصہ کو ضبط کرنے والے) مشہور ہوا ہے۔ اس میں حضرت موسیٰ کاظمؑ کے لقب کو صراحتہً سامنے رکھا گیا جبکہ موجودہ زمانے میں اسٹیشن کا نام جوادین (دو جواد المعنی فیاض) درج ہے جس میں صراحتہً حضرت امام محمد تقیؑ کے لقب کو ظاہر کیا جا رہا ہے۔ چونکہ آپ کا لقب تقی بھی تھا اور جواد بھی۔

رضوی سیّد

یہ ایک حقیقت ہے کہ جتنے سادات رضوی کہلاتے ہیں وہ در اصل تقوی ہیں یعنی حضرت امام محمد تقیؑ کی اولاد ہیں۔ اگر حضرت امام رضاؑ کی اولاد امام تقیؑ کے علاوہ کسی اور فرزند کے ذریعے سے بھی ہوتی تو امتیاز کے لیے وہ اپنے کو رضوی کہتی اور امام محمد تقیؑ کی اولاد اپنے کو تقوی کہتی مگر چونکہ امام رضاؑ کی نسل صرف امام محمد تقیؑ سے چلی اور حضرت امام رضاؑ کی شخصی شہرت سلطنتِ عباسیہ کے ولی عہد ہونے کی وجہ سے جمہور مسلمین میں بہت ہو چکی تھی اس لیے تمام اولاد کا حضرت امام رضاؑ کی طرف منسوب کر کے تعارف کیا جانے لگا اور رضوی کے نام سے مشہور ہو گئے۔

دسویں امام

حضرت علی نقی علیہ السّلام

نام و نسب

اسم مبارک علیؑ، کنیت ابوالحسنؑ اور لقب نقیؑ ہے چونکہ آپ سے پہلے حضرت علی مرتضیٰؑ اور امام رضاؑ کی کنیت ابوالحسن ہو چکی تھی۔ اس لیے آپ کو ابوالحسن ثالثؑ کہا جاتا ہے والدہ معظمہ آپ کی سمانہؑ خاتون تھیں۔

ولادت اور نشوونما

۵ رجب ۲۱۴ھ مدینہ منورہ میں ولادت ہوئی۔ صرف چھ برس اپنے والد بزرگوار کے زیر سایہ ہی زندگی بسر کی۔ اس کے بعد اس کمسنی ہی کے عالم میں آپ اپنے والد بزرگوار سے جدا ہو گئے۔ امام محمد تقیؑ کو عراق کا سفر درپیش ہوا اور وہیں ۲۹ ذیقعد ۲۲۰ھ میں حضرتؑ کی شہادت ہو گئی۔ جس کے بعد امامت کی ذمہ داریاں امام علی نقیؑ کے کاندھے پر آگئیں۔ اس صورت میں سوائے قدرت کی آغوشِ تربیت کے اور کون گہوارہ تھا جسے آپ کے علمی اور عملی کمال کی بلندیوں کا مرکز سمجھا جا سکے۔

انقلاباتِ سلطنت

حضرت امام علی نقیؑ کے دور امامت میں معتصم کا انتقال ہوا اور واثق باللہ کی حکومت شروع ہوئی۔ ۲۳۶ھ میں واثق دنیا سے رخصت ہوا اور مشہور ظالم و سفاک دشمنِ اہلبیتؑ متوکّل تختِ حکومت پر بیٹھا۔ ۲۵۰ھ میں متوکل ہلاک ہوا اور منتصر باللہ خلیفہ تسلیم کیا گیا۔

جو صرف چھ مہینہ سلطنت کرنے کے بعد مر گیا، اور مستعین باللہ کی سلطنت قائم ہوئی۔ ۲۵۲ھ میں مستعین کو حکومت سے دست بردار ہو کر جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا اور معتز باللہ بادشاہ ہوا۔ یہی امام علی نقیؑ کے زمانے کا آخری بادشاہ ہے۔

آلام و مصائب

معتصم نے خواہ اپنی ملکی پریشانیوں کی وجہ سے جو اسے رومیوں کی جنگ اور بغداد کے دارالسلطنت میں عباسیوں کے فساد وغیرہ کی وجہ سے درپیش تھیں اور خواہ امام علی نقیؑ کی کمسنی کا خیال کرتے ہوئے بہر حال حضرتؑ سے کوئی تعرض نہیں کیا اور آپ سکون و اطمینان کے ساتھ مدینہ منورہ میں اپنے فرائض پورے کرنے میں مصروف رہے۔

معتصم کے بعد واثق نے بھی آپ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا، مگر متوکل کا تختِ سلطنت پر بیٹھنا تھا کہ امام علی نقیؑ پر تکالیف و مصائب کا سیلاب امڈ آیا۔ یہ واثق کا بھائی اور معتصم کا بیٹا تھا۔ اور آلِ رسولؐ کی دشمنی میں اپنے تمام آباو اجداد سے بڑھا ہوا تھا۔

اس سولہ برس میں کہ جب سے امام علی نقیؑ منصبِ امامت پر فائز ہوئے تھے آپ کی شہرت تمام مملکتِ اسلامی میں پھیل چکی تھی اور تعلیماتِ اہلبیتؑ کے پروانے اس شمعِ ہدایت پر برابر ٹوٹ رہے تھے۔ ابھی متوکل کی سلطنت کو چار برس ہوتے تھے کہ مدینے کے حاکم عبداللہ بن حاکم نے امامؑ سے مخالفت کا آغاز کیا۔ پہلے تو خود حضرتؑ کو مختلف طرح کی تکلیفیں پہنچائیں پھر متوکل کو آپ کے متعلق اسی طرح کی باتیں لکھیں جیسی سابق سلاطین کے پاس آپ کے بزرگوں کی نسبت ان کے دشمنوں کی طرف سے پہنچائی جاتی تھیں۔ مثلاً یہ کہ حضرتؑ اپنے گرد و پیش اسبابِ سلطنت جمع کر رہے ہیں۔ آپ کے ماننے والے اتنی تعداد میں بڑھ گئے ہیں کہ آپ جب چاہیں حکومت کے مقابلہ کے لیے کھڑے ہو سکتے ہیں۔

حضرتؑ کو اس تحریر کی بروقت اطلاع ہو گئی اور آپ نے اتمامِ حجت کے طور پر

اسی کے ساتھ متوکل کے پاس اپنی جانب سے ایک خط تحریر فرمادیا جس میں حاکم مدینہ کی اپنے ساتھ ذاتی مخالفت کا تذکرہ اور اس کی غلط بیانیوں کا اظہار فرمایا تھا۔ متوکل نے ازراہِ سیاست امام علی نقیؑ کے خط کو وقعت دیتے ہوئے مدینہ کے اس حاکم کو معزول کر دیا مگر ایک فوجی رسالے کو یحییٰ بن ہرثمہ کی قیادت میں بھیج کر حضرتؑ سے بظاہر دوستانہ انداز میں باصرار یہ خواہش کی کہ آپ مدینہ سے دارالسلطنت سامرا تشریف لا کر کچھ دن قیام فرمائیں اور پھر واپس مدینہ تشریف لے جائیں۔

امام علیہ السلام اس التجا کی حقیقت سے خوب واقف تھے اور جانتے تھے یہ نیازمندانہ دعوت تشریف آوری حقیقت میں جلا وطنی کا حکم ہے مگر انکار کا کوئی حاصل نہ تھا۔ جب کہ انکار کے بعد اسی طلبی کے انداز کا دوسری شکل اختیار کر لینا یقینی تھا۔ اور اس کے بعد روانگی ناگزیر تھی۔ بے شک مدینہ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونا آپ کے قلب کے لیے ویسا ہی تکلیف دہ ایک صدمہ تھا جسے اس کے پہلے حضرت امام حسینؑ، امام موسیٰ کاظمؑ، امام رضاؑ اور امام محمد تقی علیہ السلام آپ کے مقدس اور بلند مرتبہ اجداد برداشت کر چکے تھے۔ وہ اب آپ کے لیے ایک میراث بن چکا تھا۔ پھر بھی دیکھنے والے بیان کرتے ہیں کہ مدینہ سے روانگی کے وقت آپ کے تاثرات اتنے شدید تھے جس سے احباب واصحاب میں ایک کہرام برپا تھا۔

متوکل کا عریضہ بارگاہِ امامؑ میں بڑے اخلاص اور اشتیاق قدم بوسی کا مظہر تھا فوجی دستہ جو بھیجا گیا تھا وہ بظاہر سواری کے تزک و احتشام اور امامؑ کی حفاظت کا ایک سامان تھا مگر جب حضرتؑ سامرے میں پہنچ گئے اور متوکل کو اس کی اطلاع دی گئی تو پہلا ہی اس کا افسوسناک رویہ یہ تھا کہ بجائے امامؑ کے استقبال یا کم از کم اپنے یہاں بلا کر ملاقات کرنے کے اس نے حکم دیا کہ حضرت کو "خان الصعالیک" میں اتارا جائے، اس لفظ کے معنی ہی ہیں "بھیک مانگنے والے گداگروں کی سرائے" اس سے جگہ کی نوعیت کا پورے طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے یہ شہر سے دور ویرانے میں ایک کھنڈر تھا۔ جہاں امامؑ کو فروکش ہونے پر مجبور کیا گیا۔ اگرچہ یہ مقدس حضرات خود فقر اور کے

ساتھ ہم نشینی کو اپنے لیے ننگ و عار نہیں سمجھتے تھے اور تکلفاتِ ظاہری سے کنارہ کش رہتے تھے مگر متوکل کی نیت تو اس طرزِ عمل سے بہر حال تحقیر کے سوا اور کوئی نہیں تھی۔ تین دن تک حضرت کا قیام یہاں رہا۔ اس کے بعد متوکل نے آپ کو اپنے حاجب رزاقی کی حراست میں نظر بند کر دیا اور عوام کے لیے آپ سے ملنے جلنے کو ممنوع قرار دیا۔

وہی بے گناہی اور حقانیت کی کشش جو امام موسیٰ کاظمؑ کی قید کے زمانہ میں سخت سے سخت محافظین کو کچھ دن کے بعد آپ کی رعایت پر مجبور کر دیتی تھی اسی کا اثر تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ بعد رزاقی کے دل پر امام علی نقیؑ کی عظمت کا سکہ قائم ہو گیا اور وہ آپ کو تکلیف دینے کے بجائے آرام و راحت کے سامان بہم پہنچانے لگا مگر یہ بات زیادہ عرصہ تک متوکل سے چھپ نہیں سکتی تھی۔ اسے علم ہو گیا اور اس نے رزاقی کی قید سے نکال کر حضرتؑ کو ایک دوسرے شخص سعید کی حراست میں دے دیا۔ یہ شخص بے رحم اور امام کے ساتھ سختی برتنے والا تھا۔ اسی لیے اس کے تبادلے کی ضرورت نہیں پڑی اور حضرت پورے بارہ برس اس کی نگرانی میں مقیّد رہے۔ ان تکالیف کے ساتھ جو اس قید میں تھے حضرتؑ شب و روز عبادتِ الٰہی میں بسر کرتے تھے۔ دن بھر روزہ رکھنا اور رات بھر نمازیں پڑھنا معمول تھا۔ آپ کا جسم کتنے ہی قید و بند میں رکھا گیا ہو مگر آپ کا ذکر چار دیواری میں محصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ آپ تو تنگ و تاریک کوٹھڑی میں مقید تھے مگر آپ کا چرچا سارے بلکہ شاید عراق کے ہر گھر میں تھا اور اس بلند سیرت و کردار کے انسان کو قید رکھنے پر خلقِ خدا میں متوکل کے مظالم سے نفرت برابر پھیلتی جا رہی تھی۔

اب وہ وقت آیا کہ فتح بن خاقان باوجود آلِ رسولؐ سے محبت رکھنے کے صرف اپنی قابلیت اپنے تدبر اور اپنی دماغی و عملی صلاحیتوں کی بنا پر متوکل کا وزیر ہو گیا، تو اس کے کہنے سننے سے متوکل نے امام علی نقیؑ کی قید کو نظر بندی سے تبدیل کر دیا اور آپ کو ایک زمین دے کر مکان تعمیر کرنے اور اپنے ذاتی مکان میں سکونت کی اجازت

دے دی مگر اس شرط سے کہ آپ سامرے سے باہر نہ جائیں اور سعید آپ کی نقل و حرکت اور مراسلات و تعلقات کی نگرانی کرتا رہے گا۔

اس دور میں بھی امامؑ کا استغنائے نفس دیکھنے کے قابل تھا۔ باوجود دارالسلطنت میں مستقل طور پر قیام کے نہ کبھی متوکل کے سامنے کوئی درخواست پیش کی نہ کبھی کسی قسم کے ترحم یا تکریم کی خواہش ظاہر کی دہی عبادت و ریاضت کی زندگی جو قید کے عالم میں تھی، اس نظر بندی کے دور میں بھی رہی۔ جو کچھ تبدیلی ہوئی تھی وہ ظالم کے رویہ میں تھی، مظلوم کی شان جیسے پہلے تھی ویسی ہی اب بھی قائم رہی۔ اس زمانے میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ امام کو بالکل آرام و سکون کی زندگی بسر کرنے دی جاتی۔ مختلف طرح کی تکالیف سے آپ کو دوچار ہونا پڑتا تھا کہ جو جسمانی سے زیادہ روحانی ہوتے تھے۔ مثلاً یہ کہ آپ کے مکان کی تلاشی لی گئی کہ وہاں اسلحہ ہیں یا ایسے خطوط ہیں جن سے حکومت کی مخالفت کا ثبوت ملتا ہے حالانکہ ایسی کوئی چیز ملی نہیں مگر یہ تلاشی ہی ایک بلند اور بے گناہ انسان کے لیے کتنی باعث تکلیف چیز ہے اس سے بڑھ کر یہ واقعہ کہ دربار شاہی میں عین اس وقت آپ کی طلبی ہوتی ہے جب کہ شراب کے دور چل رہے ہیں۔ متوکل اور تمام حاضرینِ دربار طرب و نشاط میں غرق ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ سرکش، بے غیرت اور جاہل بادشاہ حضرتؑ کے سامنے جام شراب بڑھا کر پینے کی درخواست کرتا ہے۔

شریعتِ اسلام کے محافظ معصومؑ کو اس سے جو تکلیف پہنچ سکتی ہے وہ تیر و خنجر سے یقیناً زیادہ ہے مگر حضرتؑ نے نہایت متانت اور صبر و سکون کے ساتھ فرمایا کہ "مجھے اس سے معاف کیجئے۔ میرا اور میرے آباؤ اجداد کا خون اور گوشت اس سے کبھی مخلوط نہیں ہوا ہے"۔

اگر متوکل کے احساسات میں کچھ بھی زندگی باقی ہوتی تو وہ اس معصومانہ مگر پُر شکوہ جواب کا اثر قبول کرتا مگر اس نے کہا کہ اچھا یہ نہیں تو کچھ گانا ہی ہم کو سنایئے۔

حضرتؑ نے فرمایا: "میں اس فن سے بھی واقف نہیں ہوں"۔

آخر اس نے کہا کہ آپ کو کچھ اشعار جس طریقے سے بھی آپ چاہیں بہرحال پڑھنا ضرور پڑھیں گے۔

کوئی جذبات کی رو میں بہنے والا انسان ہوتا تو اس خفیف الحرکات بادشاہ کے اس حقارت انگیز یا تمسخر آمیز برتاؤ سے متاثر ہو کر شاید اپنے توازن دماغی کو کھو دیتا مگر وہ کوہِ حلم و وقار، امامؑ کی ہستی تھی جو اپنے کردار کو فرائض کی مطابقت سے تکمیل تک پہنچانے کی ذمہ دار تھی، منہیات کے دائرہ سے نکل کر جب فرمائش اشعار سنانے تک پہنچی تو امامؑ نے موعظہ و تبلیغ کے لیے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اپنے دل سے نکلی ہوئی پُر صداقت آواز سے یہ اشعار پڑھنا شروع کر دیے جنھوں نے محفل طرب میں مجلسِ وعظ کی شکل پیدا کر دی۔

بَاتُوا عَلٰی قُلَلِ الْاَجْبَالِ تَحْرُسُهُمْ غُلْبُ الرِّجَالِ فَمَا اَغْنَتْهُمُ الْقُلَلُ
رہے پہاڑوں کی چوٹی پہ پہرے بٹھلا کر بہادروں کی حراست میں بچ سکے نہ مگر

وَاسْتُنْزِلُوْا بَعْدَ عِزٍّ مِنْ مَعَاقِلِهِمْ اِلٰی مَقَابِرِهِمْ یَا بِئْسَمَا نَزَلُوْا
بلند قلعوں کی عزت جو پست ہو کے رہی تو کنج قبر میں منزل بھی کیا بری پائی

نَادَاهُمْ صَارِخٌ مِنْ بَعْدِ مَا دُفِنُوْا اَیْنَ الْاَسِرَّةُ وَالتِّیْجَانُ وَالْحُلَلُ
صدا یہ ان کو دی ہاتف نے بعد دفن لحد کہاں ہیں تخت، وہ تاج اور وہ لباسِ جسد

اَیْنَ الْوُجُوْهُ الَّتِیْ کَانَتْ مُحَجَّبَةً مِنْ دُوْنِهَا تُضْرَبُ الْاَسْتَارُ وَالْکُلَلُ
کہاں وہ چہرے ہیں جو تھے ہمیشہ زیر نقاب غبار جن پہ کبھی آنے دیتے تھے نہ حجاب

فَاَفْصَحَ الْقَبْرُ عَنْهُمْ حِیْنَ سَائَلَهُمْ تِلْکَ الْوُجُوْهُ عَلَیْهَا الدُّوْدُ تَنْتَقِلُ
زبانِ حال سے بولے جواب میں مدفن وہ رخ زمین کے کیڑوں کا بن گئے مسکن

قَدْ طَالَ مَا اَکَلُوْا فِیْهَا وَهُمْ شَرِبُوْا فَاَصْبَحُوْا بَعْدَ طُوْلِ الْاَکْلِ قَدْ اُکِلُوْا
غذائیں کھائیں شرابیں جو پی تھیں حد سے سوا نتیجہ اس کا ہے خود آج بن گئے وہ غذا

اشعار کچھ ایسے حقیقی تاثرات کے ساتھ امامؑ کی زبان سے ادا ہوتے تھے کہ متوکل کے عیش و نشاط کی بساط الٹ گئی۔ شراب کے پیالے ہاتھوں سے چھوٹ گئے اور تمام

مجمع زار و قطار رونے لگا یہاں تک کہ خود متوکل ڈاڑھیں مار مار کر بے اختیار رو رہا تھا جوں ہی ذرا رونا موقوف ہوا اس نے امامؑ کو رخصت کر دیا اور آپ اپنے مکان پر تشریف لے گئے۔

ایک اور نہایت شدید روحانی تکلیف جو امامؑ کو اس دور میں پہنچی وہ متوکل کے تشدّدانہ احکام تھے جو نجف اور کربلا کے زائرین کے خلاف اس نے جاری کیے۔ اس نے یہ حکم عام تمام قلمرو حکومت میں جاری کر دیا کہ کوئی شخص جناب امیرؑ اور امام حسینؑ کے روضوں کی زیارت کو نہ جائے۔ جو بھی اس حکم کی مخالفت کرے گا اس کا خون حلال سمجھا جائے گا۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے حکم دیا کہ نجف اور کربلا کی عمارتیں بالکل گرا کر زمین کے برابر کر دی جائیں۔ تمام مقبرے کھود ڈالے جائیں اور قبر امام حسینؑ کے گرد و پیش کی تمام زمین پر کھیت بو دیئے جائیں۔ یہ ناممکن تھا کہ زیارت کے امتناعی احکام پر اہل بیت رسولؐ کے جان نثار آسانی کے ساتھ عمل کرنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سلسلہ میں ہزاروں بے گناہوں کی لاشیں خاک و خون میں تڑپتی ہوئی نظر آئیں۔ کیا اس میں شک ہے کہ ان میں سے ہر ایک مقتول کا صدمہ امامؑ کے دل پر اتنا ہی ہونا تھا جتنا کسی اپنے ایک عزیز کے بے گناہ قتل کیے جانے کا حضرتؑ کو ہو سکتا تھا۔

پھر آپ تشدّد کے ایک ایسے ماحول میں گھیر رکھے گئے تھے کہ آپ وقت کی مناسبت کے لحاظ سے ان لوگوں تک کچھ مخصوص ہدایات بھی نہیں پہنچا سکتے تھے جو ان کے لیے صحیح فرائض شرعیہ کے ذیل میں اس وقت ضروری ہوں یہ اندوہناک صورتِ حال ایک دو برس نہیں بلکہ متوکل کی زندگی کے آخری وقت تک برابر قائم رہی۔

اور سُنیئے کہ متوکل کے دربار میں حضرت امیرالمومنین علیؑ بن ابی طالبؑ کی نقلیں کی جاتی تھیں اور ان پر خود متوکل اور تمام اہل دربار ٹھٹھے لگاتے تھے۔

یہ ایسا اہانت آمیز منظر ہوتا تھا کہ ایک مرتبہ خود متوکل کے بیٹے سے رہا نہ گیا۔ اس نے متوکل سے کہا کہ خیر آپ اپنی زبان سے حضرت علیؑ کے بارے میں کچھ الفاظ استعمال

کریں مگر جب آپ اپنے کو ان کا عزیز قرار دیتے ہیں تو ان کم بختوں کی زبان سے حضرت علیؑ کے خلاف ایسی باتوں کو کیونکر گوارا کرتے ہیں اس پر بجائے کچھ اثر لینے کے متوکل نے اپنے بیٹے کا فحش آمیز تمسخر کیا اور دو شعر نظم کر کے گانے والوں کو دیئے جس میں خود اس کے فرزند کے لیے ماں کی گالی موجود تھی۔ گویّے ان شعروں کو گاتے تھے اور متوکل قہقہے لگاتا تھا۔

اسی دور کا ایک اور واقعہ بھی کچھ کم قابلِ افسوس نہیں ہے ابن السکیت بغدادی علمِ نحو ولغت کے امام مانے جاتے تھے اور متوکل نے اپنے دو بیٹوں کی تعلیم کے لیے انھیں مقرر کیا تھا۔ ایک دن متوکل نے ان سے پوچھا کہ تمھیں میرے ان دونوں بیٹوں سے زیادہ محبت ہے یا حسنؑ وحسینؑ سے؟ ابن السکیت محبتِ اہل بیتؑ رکھتے تھے اس سوال کو سنکر بیتاب ہو گئے اور انھوں نے متوکل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے دھڑک کہہ دیا کہ حسنؑ وحسینؑ کا کیا ذکر، مجھے تو علیؑ کے غلام قنبرؓ کے ساتھ ان دونوں سے کہیں زیادہ محبت ہے۔ اس جواب کا سننا تھا کہ متوکل غصّے سے بیخود ہو گیا۔ حکم دیا کہ ابن السکیت کی زبان گدّی سے کھینچ لی جائے۔ یہی ہوا اور اس طرح یہ آلِ رسولؐ کے فدائی درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

ان واقعات کا براہِ راست جسمانی طور پر حضرت امام علی نقیؑ سے تو کوئی تعلق نہ تھا مگر بخدا ان کی ہر ہر بات ایک تلوار کی دھار تھی جو گلے پر نہیں دل پر چلا کرتی تھی۔ متوکل کا ظالمانہ رویّہ ایسا تھا جس سے کوئی بھی دور یا نزدیک کا شخص اس سے خوش یا مطمئن نہیں تھا۔ حد یہ ہے کہ اس کی اولاد تک اس کی جانی دشمن ہو گئی تھی، چنانچہ اسی کے بیٹے منتصر نے اس کے بڑے مخصوص غلام باغر رومی کو ملا کر خود متوکل ہی کی تلوار سے عین اس کی خواب گاہ میں اس کو قتل کرا دیا۔ جس کے بعد خلائق کو اس ظالم انسان سے نجات ملی اور منتصر کی خلافت کا اعلان ہو گیا۔

منتصر نے تختِ حکومت پر بیٹھتے ہی اپنے باپ کے متشددانہ احکام کو یکلخت منسوخ کر دیا۔ نجف اور کربلا کی زیارت کے لیے عام اجازت دے دی اور ان مقدس روضوں کی

کسی حد تک تعمیر کرادی۔ امام علی نقیؑ کے ساتھ بھی اس نے کسی خاص تشدد کا مظاہرہ نہیں کیا مگر منتصر کی عمر طولانی نہیں ہوئی۔ وہ چھ مہینہ کے بعد دنیا سے اٹھ گیا منتصر کے بعد مستعین کی طرف سے امامؑ کے خلاف کسی خاص بدسلوکی کا برتاؤ نظر نہیں آتا۔

امام علیہ السلام نے چونکہ مکان بنا کر مستقل قیام اختیار فرمالیا تھا اس لیے یا تو خود آپ ہی نے مناسب نہ سمجھا یا پھر ان بادشاہوں کی طرف سے آپ کے مدینہ واپس جانے کو پسند نہ کیا گیا ہو۔ بہرحال جو بھی وجہ ہو قیام آپ کا سامرہ ہی میں رہا۔ اتنے عرصے تک حکومت کی طرف سے مزاحمت نہ ہونے کی وجہ سے علوم اہلبیتؑ کے طلب گار ذرا اطمینان کے ساتھ کثیر تعداد میں آپ سے استفادہ کے لیے جمع ہونے لگے جس کی وجہ سے مستعین کے بعد معتز کو پھر آپ سے پرخاش پیدا ہوئی اور اس نے آپ کی زندگی ہی کا خاتمہ کر دیا۔

اخلاق واوصاف

حضرت کی سیرت زندگی اور اخلاق وکمالات وہی تھے جو اس سلسلۂ عصمت کے ہر فرد کے اپنے اپنے دور میں امتیازی طور پر مشاہدہ میں آتے رہے تھے۔ قید خانے اور نظر بندی کا عالم ہو یا آزادی کا زمانہ ہر وقت اور ہر حال میں یاد الٰہی، عبادت، خلق خدا سے استغنا، ثبات قدم، صبر واستقلال مصائب کے ہجوم میں ماتھے پر شکن نہ ہونا دشمنوں کے ساتھ بھی حلم ومروّت سے کام لینا، محتاجوں اور ضرورت مندوں کی امداد کرنا یہی اوصاف ہیں جو امام علی نقیؑ کی سیرت زندگی میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔

قید کے زمانہ میں جہاں بھی آپ رہے آپ کے مصلے کے سامنے ایک قبر کھدی ہوئی تیار رہتی تھی۔ دیکھنے والوں نے جب اس پر حیرت ودہشت کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا میں اپنے دل میں موت کا خیال قائم رکھنے کے لیے یہ قبر اپنی نگاہوں کے سامنے تیار رکھتا ہوں۔ حقیقت میں یہ ظالم طاقت کو اس کے باطل مطالبہ اطاعت اور اسلام کے حقیقی تعلیمات کی نشر واشاعت کے ترک کر دینے کی خواہش کا ایک خاموش اور عملی جواب تھا۔

یعنی زیادہ سے زیادہ سلاطین وقت کے ہاتھ میں جو کچھ ہے وہ جان کا لے لینا مگر جو شخص موت کے لیے اتنا تیار ہو کہ ہر وقت کھدی ہوئی قبر اپنے سامنے رکھے وہ ظالم حکومت سے ڈر کر سرِ تسلیم خم کرنے پر کیونکر مجبور کیا جا سکتا ہے مگر اس کے ساتھ دنیوی سازشوں میں شرکت یا حکومت وقت کے خلاف کسی بے محل اقدام کی تیاری سے آپ کا دامن اس طرح بری رہا کہ باوجود دارالسلطنت کے اندر مستقل قیام اور حکومت کے سخت ترین جاسوسی نظام کے کبھی آپ کے خلاف کوئی الزام صحیح ثابت نہیں ہو سکا اور کبھی سلاطین وقت کو کوئی دلیل آپ کے خلاف تشدد کے جواز کی نہ مل سکی باوجود یہ کہ سلطنت عباسیہ کی بنیادیں اس وقت اتنی کھوکھلی ہو رہی تھیں کہ دارالسلطنت میں ہر روز ایک نئی سازش کا فتنہ کھڑا ہوتا تھا۔

متوکل سے خود اس کے بیٹے منتصر کی مخالفت اور اس کے انتہائی عزیز غلام باغر رومی کی اس سے دشمنی، منتصر کے بعد امرائے حکومت کا انتشار اور آخر متوکل کے بیٹوں کو خلافت سے محروم کرنے کا فیصلہ مستعین کے دورِ حکومت میں یحییٰ بن عمر بن یحییٰ حسین بن زید علوی کا کوفہ میں خروج اور حسن بن زید الملقب بداعی الحق کا علاقہ، طبرستان پر قبضہ کر لینا اور مستقل سلطنت قائم کر لینا، پھر دارالسلطنت میں ترکی غلاموں کی بغاوت مستعین کا سامرے کو چھوڑ کر بغداد کی طرف بھاگنا اور قلعہ بند ہو جانا، آخر کو حکومت سے دستبرداری پر مجبور ہونا اور کچھ عرصہ کے بعد معتز باللہ کے ہاتھ سے تلوار کے گھاٹ اترنا پھر معتز باللہ کے دور میں رومیوں کا مخالفت پر تیار رہنا معتز باللہ کو خود اپنے بھائیوں سے خطرہ محسوس ہونا اور مؤید کی زندگی کا خاتمہ اور موفق کا بصرہ میں قید کیا جانا۔

ان تمام ہنگامی حالات، ان تمام شورشوں، ان تمام بے چینیوں اور جھگڑوں میں سے کسی میں بھی امام علی نقیؑ کی شرکت کا شبہ تک نہ پیدا ہونا کیا اس طرزِ عمل کے خلاف نہیں ہے جو ایسے موقعوں پر جذبات سے کام لینے والے انسانوں کا ہوا کرتا ہے۔ ایک ایسے اقتدار کے مقابلے میں جسے نہ صرف وہ حق و انصاف کی رو سے ناجائز سمجھتے ہیں

بلکہ اس کی بدولت انھیں جلا وطنی، قید اور اہانتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے مگر وہ جذبات سے بلند اور عظمتِ نفس کا کامل مظہر دنیوی ہنگاموں اور وقت کے اتفاقی موقعوں سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا اپنی بے لوث حقانیت اور کوہ سے بھی گراں صداقت کے خلاف سمجھتا ہے اور مخالف پر پسِ پشت سے حملہ کرنے کو اپنے بلند نقطۂ نگاہ اور معیارِ عمل کے خلاف جانتے ہوتے ہمیشہ کنارہ کش رہتا ہے۔

وفات

معتز باللہ کے دور میں تیسری رجب ۲۵۴ھ کو سامرے میں آپ نے رحلت فرمائی۔ اس وقت آپ کے پاس صرف آپ کے فرزند امام حسن عسکریؑ موجود تھے۔ آپ ہی نے اپنے والدِ بزرگوار کی تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ کے فرائض انجام دیئے اور اسی مکان میں جس میں حضرتؑ کا قیام تھا۔ ایوانِ خاص میں آپ کو دفن کر دیا وہیں اب آپ کا روضہ بنا ہوا ہے اور عقیدت مند زیارت سے شرفیاب ہوتے ہیں۔

maablib.org

مرکز احیاء آثار برّ صغیر
MAAB 1431
maablib.org

گیارہویں امام

حضرت حسن عسکری علیہ السلام

نام ونسب

ابو محمدؑ کنیت حسنؑ نام اور سامرے کے محلہ عسکر میں قیام کی وجہ سے عسکریؑ مشہور لقب ہے. والد بزرگوار حضرت امام علی نقیؑ اور والدہ سلیلؑ خاتون تھیں جو عبادت، ریاضت، عفت اور سخاوت کے صفات میں اپنے طبقے کے لیے مثال کی حیثیت رکھتی تھیں

ولادت

۱۰ ربیع الثانی ۲۳۲ھ مدینہ منورہ میں ولادت ہوئی

نشوونما اور تربیت

بچپن کے گیارہ سال تقریباً اپنے والدِ بزرگوار کے ساتھ وطن میں رہے جس کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ یہ زمانہ اطمینان سے گزرا. اس کے بعد امام علی نقیؑ کو سفر عراق درپیش ہوگیا اور تمام متعلقین کے ساتھ ساتھ امام حسن عسکریؑ اسی کم سنی کے عالم میں سفر کی زحمتوں کو اٹھا کر سامرے پہنچے. یہاں کبھی قید کبھی کسی حد تک آزادی، مختلف دور سے گزرنا پڑا مگر ہر حال میں آپ اپنے بزرگ مرتبہ باپ کے ساتھ ہی ساتھ رہے. اس طرح باطنی اور ظاہری طور پر ہر حیثیت سے آپؑ کو اپنے والد بزرگوارؑ کی تربیت و تعلیم سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا موقع مل سکا.

زمانہ امامت

۲۵۴ھ میں آپ کی عمر بائیس برس کی تھی جب آپ کے والد بزرگوار حضرت امام علی نقیؑ کی وفات ہوئی حضرتؑ نے اپنی وفات سے چار مہینہ قبل آپ کے متعلق اپنے وصی و جانشین ہونے کا اظہار فرما کر اپنے اصحاب کی گواہیاں لے لی تھیں۔ اب امامت کی ذمہ داریاں امام حسن عسکریؑ کے متعلق ہوئیں جنھیں آپ باوجود انتہائی شدید مشکلات اور سخت ترین ماحول کے ادا فرماتے رہے۔

سلاطینِ وقت اور ان کا رویہ

جیسا کہ اس سے پہلے ضمناً بیان ہوا امام حسن عسکریؑ کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ ان تمام تکالیف اور مصائب میں بھی شریک رہے جو آپ کے والد بزرگوار کو حراست اور نظر بندی کے ذیل میں بھی متعدد بار برداشت کرنا پڑے۔ اس کے بعد جب آپ کا دورِ امامت شروع ہوا ہے تو سلطنت بنی عباس کے تخت پر معتز باللہ عباسی کا قیام تھا۔ معتز کی معزولی کے بعد مہتدی کی سلطنت ہوئی۔ گیارہ مہینے چند روز حکومت کرنے کے بعد اس کا خاتمہ ہوا اور معتمد کی حکومت قائم ہوئی۔ ان میں سے کوئی ایک بادشاہ بھی ایسا نہ تھا جس کے زمانہ میں امام حسن عسکریؑ کو آرام و سکون ملتا۔ باوجود یہ کہ اس وقت سلطنت بنی عباس بڑی سخت الجھنوں اور پیچیدگیوں میں گرفتار تھی مگر ان تمام سیاسی مسائل اور مشکلات کے ساتھ ہر حکومت نے امام حسن عسکریؑ کو قید و بند میں رکھنا سب سے زیادہ ضروری سمجھا۔ اس کا خاص سبب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث تھی کہ میرے بعد بارہ جانشین ہوں گے اور ان میں سے آخری مہدیٔ آخر الزمان اور قائم آلِ محمدؐ ہوگا۔ یہ حدیث برابر متواتر طریقہ سے عالمِ اسلام میں گردش کرتی رہی تھی۔

خلفائے بنی عباس خوب جانتے تھے کہ سلسلہ آلِ محمدؐ کے وہ افراد جو رسولؐ کی صحیح جانشینی کے مصداق ہو سکتے ہیں وہ یہی افراد ہیں جن میں سے گیارہویں ہستی امام حسن عسکریؑ

کی ہے اس لیے ان ہی کا فرزند وہ ہو سکتا ہے جس کے بارے میں رسولؐ کی پیشین گوئی صحیح قرار پا سکے۔ لہٰذا کوشش یہ تھی کہ ان کی زندگی کا دنیا سے خاتمہ ہو جائے اس طرح کہ ان کا کوئی جانشین دنیا میں موجود نہ ہو۔ یہ سبب تھا کہ امام حسن عسکریؑ کے لیے اس نظر بندی پر اکتفا نہیں کی گئی جو امام علی نقیؑ کے لیے ضروری سمجھی گئی تھی بلکہ آپ کے لیے اپنے گھر بار سے الگ قید تنہائی کو ضروری سمجھا گیا۔ یہ اور بات ہے کہ قدرتی انتظام کے تحت درمیان میں انقلاب سلطنت کے وقفے آپ کی قید مسلسل کے بیچ میں تھوڑی رہائی کے سامان پیدا کر دیا کرتے تھے مگر پھر بھی جو بادشاہ تخت سلطنت پر بیٹھتا تھا وہ اپنے پیش رو کے نظریہ کے مطابق آپ کو دوبارہ مقید کرنے پر تیار ہو جاتا تھا۔ اس طرح آپ کی مختصر زندگی جو دورِ امامت کے بعد تھی اس کا بیشتر حصہ قید و بند ہی میں گزرا۔

اس قید کی سختی معتمد کے زمانے میں بہت بڑھ گئی تھی۔ اگرچہ وہ مثل دیگر سلاطین کے آپ کے مرتبہ اور حقانیت سے خوب واقف تھا چنانچہ جب قحط کے موقع پر ایک عیسائی راہب کے دعوے کے ساتھ پانی برسانے کی وجہ سے مسلمانوں میں ارتداد کا فتنہ برپا ہوا اور لوگ عیسائیت کی طرف دوڑنے لگے تو مسلمانوں کو گمراہی سے بچانے کے لیے وہ امام حسن عسکریؑ ہی تھے جو قید خانے سے باہر لائے گئے۔ آپ نے مسلمانوں کے شکوک کو دور کر کے انھیں اسلام کے جادہ پر قائم رکھا۔ اس واقعہ کا اثر اتنا ہوا کہ اب معتمد کو آپ کے پھر اسی قید خانے میں واپس کرنے میں خجالت دامنگیر ہوئی۔ اس لیے آپ کی قید کو آپ کے گھر میں نظر بندی کے ساتھ تبدیل کر دیا گیا مگر آزادی پھر بھی نصیب نہ ہو سکی۔

سفراء کا تقرر

آئمہ اہل بیتؑ جس حال میں بھی ہوں ہمیشہ کسی نہ کسی صورت سے امامت کے فرائض کو انجام دیتے رہتے تھے۔ امام حسنؑ عسکری پر اتنی شدید پابندیاں عائد تھیں کہ

علومِ اہل بیتؑ کے طلبگاروں اور شریعتِ جعفری کے مسائل دریافت کرنے والوں کا آپ تک پہنچنا کسی صورت سے ممکن نہ تھا۔ اس لیے حضرتؑ نے اپنے زمانہ میں یہ انتظام کیا کہ ایسے افراد جو امانت و دیانت نیز علمی و فقہی بصیرت کے اس درجہ حامل تھے کہ امامؑ کے محلِ اعتماد ہو سکیں انھیں اپنی جانب سے آپ نے نائب مقرر کر دیا تھا۔ یہ حضرات جہاں تک کہ خود اپنے واقفیت کے حدود میں دیکھتے تھے اس حد تک مسائل خود ہی بتا دیتے تھے اور وہ اہم مسائل جو ان کی دسترس سے باہر ہوتے تھے انھیں اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے اور کسی مناسب موقع پر امامؑ کی خدمت میں رسائی حاصل کر کے ان کو حل کرا لیتے تھے کیونکہ ایک شخص کا کبھی کبھی امامؑ سے ملاقات کو آ جانا حکومت کے لیے اتنا ناقابلِ برداشت نہیں ہو سکتا تھا جتنا کہ عوام کی جماعتوں کا مختلف اوقات میں حضرتؑ تک پہنچنا۔

ان ہی سفراء کے ذریعے سے ایک اور اہم خدمت بھی انجام پاتی تھی۔ وہ یہ کہ خمس جو حکومتِ الٰہیہ کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اس نظامِ حکومت کو تسلیم کرنے والے ہمیشہ آئمہ معصومینؑ کی خدمت میں پہنچاتے رہے اور ان بزرگوں کی نگرانی میں وہ ہمیشہ دینی امور کے انصرام اور سادات کی تنظیم و پرورش میں صرف ہوتا رہا اب وہ رازدارانہ طریقہ پر ان ہی نائبوں کے پاس آتا تھا اور یہ امام علیہ السلام سے ہدایت حاصل کر کے انھیں ضروری مصارف میں صرف کرتے تھے یہ افراد اس حیثیت سے بڑے سخت امتحان کی منزل میں تھے کہ ان کو ہر وقت سلطنت وقت کے جاسوسوں کی سراغرسانی کا اندیشہ رہتا تھا۔ اسی لیے عثمانؓ بن سعید اور ان کے بیٹے ابو جعفر محمدؓ بن عثمان نے جو امام حسن عسکریؑ کے ممتاز نائب تھے اور عین دارالسلطنت بغداد میں مقیم تھے اپنے اس متعلقہ افراد کی آمد و رفت کو حق بجانب قرار دینے کے لیے ایک بڑی دکان روغنیات کی کھول لی تھی۔ اس طرح حکومت جور کے شدید شکنجۂ ظلم کے اندر بھی حکومتِ الٰہیہ کا آئینی نظام چل رہا تھا اور حکومت کا کچھ بس نہ چلتا تھا۔

اخلاق واوصاف

آپ اسی سلسلۂ عصمت کی ایک لڑی تھے جس کا ہر حلقہ انسانی کمالات کے جواہر سے مرصع تھا۔ علم وحلم، عفو وکرم، سخاوت وایثار سب ہی اوصاف بے مثال تھے عبادت کا یہ عالم تھا کہ اس زمانے میں بھی کہ جب آپ سخت قید میں تھے معتمد نے جس سے آپ کے متعلق دریافت کیا یہی معلوم ہوا کہ آپ دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر نمازیں پڑھتے ہیں اور سوائے ذکر الٰہی کے کسی سے کوئی کلام نہیں فرماتے۔ اگرچہ آپ کو اپنے گھر پر آزادی کے سانس لینے کا موقع بہت ہی کم ملا۔ پھر بھی جتنے عرصہ تک قیام رہا دور دراز سے لوگ آپ کے فیض وعطا کے تذکرے سن کر آتے تھے اور بامراد واپس جاتے تھے۔ آپ کے اخلاق واوصاف کی عظمت کا عوام وخواص سب ہی کے دلوں پر سکہ قائم تھا۔ چنانچہ جب احمد بن عبداللہ بن خاقان کے سامنے جو خلیفہ عباسی کی طرف سے شہر قم کے اوقات وصدقات کے شعبہ کا افسر اعلیٰ تھا سادات علوی کا تذکرہ آگیا تو وہ کہنے لگا کہ مجھے کوئی حسن عسکریؑ سے زیادہ مرتبہ اور علم وورع، زہد وعبادت، وقار وہیبت، حیا وعفت، شرف وعزت اور قدر ومنزلت میں ممتاز اور نمایاں نہیں معلوم ہوا۔ اس وقت جب امام علی نقیؑ کا انتقال ہوا اور لوگ تجہیز وتکفین میں مشغول تھے تو بعض گھر کے ملازمین نے اثاث البیت وغیرہ میں سے کچھ چیزیں غائب کردیں اور انھیں خبر تک نہ تھی کہ امامؑ کو اس کی اطلاع ہو جائے گی۔ جب تجہیز وتکفین وغیرہ سے فراغت ہوئی تو آپ نے ان نوکروں کو بلایا اور فرمایا کہ جو کچھ پوچھتا ہوں اگر تم مجھ سے سچ سچ بیان کرو گے تو میں تمھیں معاف کر دوں گا اور سزا نہ دوں گا لیکن اگر غلط بیانی سے کام لیا تو پھر میں تمھارے پاس سے سب چیزیں برآمد بھی کرالوں گا اور سزا بھی دوں گا۔ اس کے بعد آپ نے ہر ایک سے ان اشیائ کے متعلق جو اس کے پاس تھیں دریافت کیا اور جب انھوں نے سچ بیان کر دیا تو ان تمام چیزوں کو ان سے واپس لے کر آپ نے ان کو کسی قسم کی سزا نہ دی اور معاف فرما دیا۔

علمی مرکزیت

باوجودیہ کہ آپ کی عمر بہت مختصر ہوئی یعنی صرف اٹھائیس برس مگر اس محدود اور مشکلات سے بھری ہوئی زندگی میں بھی آپ کے علمی فیوض کے دریا نے بڑے بڑے بلند پایہ علماؑ کو سیراب ہونے کا موقع دیا نیز اس زمانے کے فلاسفہ کا جو دہریت اور الحاد کی تبلیغ کر رہے تھے مقابلہ فرمایا جس میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ ان میں ایک اسحٰق کندی کا واقعہ ہے کہ یہ شخص قرآن مجید کے آیات کے باہمی تناقص کے متعلق ایک کتاب لکھ رہا تھا۔ یہ خبر امام حسن عسکریؑ کو پہنچی اور آپ موقع کے منتظر ہو گئے۔ اتفاق سے ایک روز ابو اسحٰق کے کچھ شاگرد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ تم میں کوئی اتنا سمجھدار آدمی نہیں ہے جو اپنے استاد کندی کو اس فضول مشغلے سے روکے جو انھوں نے قرآن کے بارے میں شروع کر رکھا ہے۔ ان طلاّب نے کہا حضور! ہم تو ان کے شاگرد ہیں۔ ہم بھلا ان پر کیا اعتراض کر سکتے ہیں؟

حضرتؑ نے فرمایا! اتنا تو تم کر سکتے ہو جو کچھ باتیں میں تمھیں بتاؤں وہ تم ان کے سامنے پیش کر دو۔ طلاّب نے کہا، جی ہاں ہم اتنا کر سکتے ہیں۔

حضرتؑ نے کچھ آئتیں قرآن کی جن کے متعلق باہمی اختلاف کا توہّم ہو رہا تھا پیش فرما کر ان سے کہا کہ تم اپنے استاد سے اتنا پوچھو کہ کیا ان الفاظ کے بس یہی معنیٰ ہیں جن کے لحاظ سے وہ تناقص ثابت کر رہے ہیں اور اگر کلام عرب کے شواہد سے دوسرے متعارف معنیٰ نکل آئیں جن کے بنا پر الفاظ قرآن میں باہم کوئی اختلاف نہ رہے تو پھر انھیں کیا حق ہے کہ وہ اپنے ذہنی خود ساختہ معنی کو متکلم قرآنی کی طرف منسوب کر کے تناقص و اختلاف کی عمارت کھڑی کریں۔ اس ذیل میں آپ نے کچھ شواہد کلام عرب کے بھی ان طلاّب کے ذہن نشین کرائے۔ ذہین طلاّب نے وہ پوری بحث اور شواہد کے حوالے محفوظ کر لیے اور اپنے استاد کے پاس جا کر ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد یہ سوالات پیش کر دیئے۔ آدمی بہر حال وہ منصف مزاج تھا۔ اس نے طلاّب کی زبانی وہ سب کچھ

سنا اور کہا کہ یہ باتیں تمھاری قابلیت سے بالاتر ہیں۔ سچ سچ بتانا کہ یہ تمھیں معلوم کہاں سے ہوئیں پہلے تو ان طالب علموں نے چھپانا چاہا اور کہا کہ یہ چیزیں خود ہمارے ذہن میں آئی ہیں مگر جب اس نے سختی کے ساتھ انکار کیا کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا تو انھوں نے بتایا کہ ہمیں ابو محمد حسن عسکریؑ نے یہ باتیں بتائی ہیں یہ سن کر اس نے کہا کہ سوائے اس گھرانے کے اور کہیں سے یہ معلومات حاصل ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر اس نے آگ منگوائی اور جو کچھ لکھا تھا، نذر آتش کر دیا ایسے کتنے ہی علمی اور دینی خدمات تھے جو خاموشی کے ساتھ انجام پار ہے تھے اور حکومت وقت جو محافظت اسلام کی دعویدار تھی۔ اپنے عیش و طرب کے نشے میں مدہوش تھی یا پھر چونکتی بھی تھی تو ایسے مخلص حامی اسلام کی طرف سے اپنی سلطنت کے لیے خطرہ محسوس کر کے ان پر کچھ پابندیاں بڑھا دیئے جانے کے احکام نافذ کرتی تھی۔ مگر اس کوہ گراں کے صبر و استقلال میں فرق نہ آتا تھا۔

جوامع حدیث میں محدثین اسلام نے آپ کی سند سے احادیث نقل کیے ہیں ان میں سے ایک خاص حدیث شراب خواری کے متعلق ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ "شَارِبُ الْخَمْرِ كَعَابِدِ الْوَثَنِ" "شراب پینے والا مثل بُت پرست کے ہے"۔

اس کو ابن الجوزی نے اپنی کتاب تحریم الخمر میں سندِ متصل کے ساتھ درج کیا ہے اور ابو نعیم فضل بن وکیل نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ثابت ہے جس کی اہلبیتؑ طاہرین نے روایت کی ہے اور صحابہ میں سے ایک گروہ نے بھی اس کی رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے جیسے ابن عباس، ابو ہریرہ، انس، عبداللہ بن اوفی، سلمی اور دوسرے حضرات۔

سمعانی نے کتاب الانساب میں لکھا ہے کہ "ابو محمد احمد بن ابراہیم بن ہاشم علوی بلاذری، حافظ واعظ نے مکہ معظمہ میں امام اہل بیت ابو محمد حسن بن علی بن محمد بن علی موسیٰ الرضاؑ سے احادیث سن کر قلم بند کیے"۔

ان کے علاوہ حضرتؑ کے تلامذہ میں سے چند باوقار ہستیوں کے نام درج ذیل ہیں

جن میں سے بعض نے حضرتؑ کے علمی افادات کو جمع کر کے کچھ کتابیں بھی تصنیف کیں۔

۱۔ ابو ہاشم داؤد بن قاسم جعفری سن رسیدہ عالم تھے۔ انھوں نے امام رضاؑ سے امام حسن عسکریؑ تک چار اماموں کی زیارت کی اور ان بزرگواروں سے فیوض بھی حاصل کیے وہ امام علیہ السلام کی طرف سے نیابت کے درجہ پر فائز تھے۔

۲۔ داؤد بن ابی زید نیشاپوری امام علی نقیؑ کے بعد امام حسن عسکریؑ کی صحبت سے شرفیاب ہوتے۔

۳۔ ابو طاہر محمد بن علی بن بلال۔

۴۔ ابو العباس عبد اللہ بن جعفر حمیری قمی بڑے بلند پایہ عالم بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ جن میں سے قرب الاسناد کتاب اس وقت تک موجود ہے اور کافی وغیرہ کے ماخذوں میں سے ہے۔

۵۔ محمد بن احمد بن جعفر قمی حضرتؑ کے خاص نائبین میں سے تھے۔

۶۔ جعفر بن سہیل صیقل۔ یہ بھی نائب خاص ہونے کا شرف رکھتے تھے۔

۷۔ محمد بن حسن صفار قمی بڑے مرتبہ کے عالم متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے بصائر الدرجات مشہور کتاب ہے۔ انھوں نے امام حسن عسکریؑ کی خدمت میں تحریری مسائل بھیج کر ان کے جوابات حاصل کیے۔

۸۔ ابو جعفر ہمانی برمکی نے امام حسن عسکریؑ سے مسائل فقہ کے جوابات حاصل کر کے کتاب مرتب کی۔

۹۔ ابراہیم بن ابی حفص ابو اسحٰق کاتب حضرتؑ کے اصحاب میں سے ایک کتاب کے مصنف ہیں۔

۱۰۔ ابراہیم بن مہر یار مصنف کتاب البشارت۔

۱۱۔ احمد بن ابراہیم بن اسمٰعیل بن داؤد بن حمدان الکاتب الندیم علم لغت وادب کے مسلّم استاد تھے اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، حضرت امام حسن عسکریؑ سے خاص خصوصیت رکھتے تھے۔

۱۲۔ احمد بن اسحٰق الاشعری ابو علی القمی بڑے پایہ کے مستند و مسلم عالم تھے، ان کی تصانیف میں سے علل الصوم اور دیگر متعدد کتابیں تھیں۔

یہ چند نام بطور مثال درج کیے گیے ہیں اگر تمام ان افراد کا تذکرہ کیا جائے تو اس کے لیے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ خصوصیت کے ساتھ تفسیر قران میں ابو علی حسن بن خالد بن محمد بن علی برقی نے آپ کے افادات سے ایک ضخیم کتاب لکھی جسے حقیقت میں خود حضرتؑ ہی کی تصنیف سمجھنا چاہیے یعنی حضرتؑ بولتے جاتے تھے اور وہ لکھتے جاتے تھے۔ علماءٔ نے لکھا ہے کہ یہ کتاب ایک سو بیس اجزاء پر مشتمل تھی۔

افسوس ہے کہ یہ علمی ذخیرہ اس وقت ہاتھوں میں موجود نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ اسی سے ماخوذ ہوں لیکن ایک کتاب جو تفسیر امام حسن عسکریؑ کے نام سے شائع شدہ موجود ہے مگر وہ مذکورہ بالا ذخیرۂ علمی سے الگ ہے۔ اس کا پتہ صرف چوتھی صدی ہجری سے چلتا ہے اور شیخ صدوق محمد بن علی بابو یہ قمی رحمۃ اللہ نے اس کو معتبر سمجھا ہے مگر ان کے پیش نظر وہ افراد جن سے موصوف نے اس تفسیر کو نقل کیا ہے بالکل مجہول الحال ہیں۔ بہر حال اس تفسیر کے متعلق علماء رجال مطمئن نہیں ہیں۔ جہاں تک غور کیا جاتا ہے اس کی نسبت امام حسن عسکریؑ کی طرف صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ ہاں بے شک آپ کا ایک طویل مکتوب اسحٰق بن اسمٰعیل اشعری کے نام اور کافی ذخیرہ مختصر حکیمانہ مقولات اور مواعظ و تعلیمات کا کتاب تحف العقول میں محفوظ ہے جو اس وقت بھی اہلِ نظر کے لیے سرمۂ چشم بصیرت ہے۔

یہ علمی کارنامے اس حالت میں ہیں جب کہ مجموعی عمر آپ کی ۲۸ برس سے زیادہ نہ ہو سکی اور اپنے والد بزرگوار کے بعد صرف چھ برس امامت کے منصب پر فائز رہے اور وہ بھی ان مشکلات کے شکنجہ میں جن کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔

وفات

اتنے علمی و دینی مشاغل میں مصروف انسان کو کہیں سلطنت وقت کے ساتھ

مزاحمت کا کوئی خیال پیدا ہو سکتا ہے مگر ان کا بڑھتا ہوا روحانی اقتدار اور علمی مرجعیت ہی تو ہمیشہ ان حضرات کو سلاطین کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت کرتی رہی۔ وہی اب بھی ہوا اور معتمد عباسی کے بھجوائے ہوتے زہر سے ۸ ربیع الاوّل ۲۶۰ھ میں آپ نے شہادت پائی اور اپنے والد بزرگوار کی قبر کے پاس سامرے میں دفن ہوئے جہاں حضرتؑ کا روضہ باوجود ناموافق ماحول کے مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔

MAAB 1431
مرکز احیاء آثار برّ صغیر
maablib.org

بارہویں امام

صاحب العصر و الزمان حضرت حجت منتظر

عجل اللہ فرجہٗ

نام و نسب

جو اپنے جدِ بزرگوار حضرت پیغمبرِ خداؐ کے بالکل ہمنام اور صورت و شکل میں ہو بہو ان کی تصویر ہیں۔ والدہ گرامی آپ کی نرجس خاتونؑ قیصرِ روم کی پوتی اور شمعون وصیّ حضرت عیسیٰؑ کی اولاد سے تھیں۔ امام حسن عسکریؑ کی ہدایت سے حضرتؑ کی بزرگ مرتبت ہمشیرہ حلیمہ خاتونؑ نے ان کو مسائلِ دینیہ اور احکامِ شرعیہ کی تعلیم دی تھی۔

القاب و خطابات

غالباً آئمہ معصومینؑ میں حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے بعد سب سے زیادہ القاب ہمارے امامِ عصر کے ہیں جن میں زیادہ مشہور ذیل کے خطابات ہیں۔

۱۔ المہدیؑ

یہ ایک ایسا خطاب ہے جو نام کا قائم مقام بن گیا ہے اور پیشنگوئیاں جو آپ کے وجود کے متعلق پیغمبرِ اکرمؐ اور دیگر آئمہ معصومینؑ کی زبان پر آئی ہیں وہ زیادہ تر اس لفظ کے ساتھ ہیں اور اسی لیے آنے والے مہدیؑ کا اقرار تقریباً ضروریاتِ اسلام میں داخل ہو گیا ہے جس میں اگر اختلاف ہو سکتا ہے تو اوصاف و حالات کے تعین میں لیکن

لیکن اصل مہدیؑ کے ظہور کا عقیدہ مسلمانوں میں ہر شخص کو رکھنا لازمی ہے۔ ان حضرات کا ذکر نہیں جو اپنے کو مسلمان صرف سوسائٹی کے اثر یا سیاسی مصلحتوں سے کہتے ہیں مگر ان کے دل میں حاضر و ناظر معدلت پسند رب الارباب کا عقیدہ ہی موجود نہیں تو اس کے رسولؐ کی کسی ایسی خبر غیبی کی تصدیق جو ابھی وقوع میں نہیں آئی ان کے حاشیۂ خیال میں کہاں جگہ پا سکتی ہے؟

(مہدیؑ کے لفظ کے معنی "ہدایت پائے ہوئے" کے ہیں۔ اسی لحاظ سے کہ "اصل ہادی" (راستہ بتانے والی) ذات خالق ہے جس کے لحاظ سے خود پیغمبرؐ سے خطاب کر کے قرآنِ کریم میں یہ آیت آئی ہے (اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ) تمہارے بس کی بات نہیں ہے کہ جس کو چاہو تم ہدایت کر دو بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔ اور اسی اعتبار سے سورۃ الحمد میں بارگاہِ الٰہی میں دعا کی گئی ہے۔ اهدنا الصراط المستقیم ہم کو سیدھے راستے پر لگا دے۔ اس فقرہ کو خود پیغمبرؐ اور آئمہ معصومینؑ بھی اپنی زبان پر جاری کرتے تھے اس لیے خداوند عالم کی ہدایت کے لحاظ سے ان رہنمایانِ دین کو مہدیؑ کہنا صحیح تھا جو صفت کے لحاظ سے سب ہی بزرگوار تھے اور خطاب کے لحاظ سے حضرت امام منتظرؑ کے ساتھ مخصوص ہو گیا۔)

۲۔ القائمؑ

یہ لقب ان احادیث سے ماخوذ ہے جس میں جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "دنیا ختم نہیں ہو سکتی جب تک میری اولاد میں سے ایک شخص قائم (کھڑا) نہ ہو جو دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے۔

۳۔ صاحب الزمانؑ

اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ آپ ہمارے زمانے کے رہنمائے حقیقی ہیں۔

۴۔ حجتِ خدا ؑ

ہر نبیؑ اور امامؑ اپنے دور میں خالق کی حجت ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے ہدایت کی ذمہ داری جو اللہ پر ہے وہ پوری ہوتی ہے اور بندوں کے پاس اپنی کوتاہیوں کے جواز کی کوئی سند نہیں رہتی۔ چونکہ ہمارے زمانہ میں رہنمائی خلق کی ذمہ داری حضرتؑ کے ذریعے سے پوری ہوئی ہے اس لیے قیامِ قیامت تک "حجتِ خداؑ" آپ ہیں۔

۵۔ مُنتَظَرؑ

چونکہ امام مہدیؑ کے ظہور کی بشارتیں برابر رہنمایانِ دین دیتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ صرف مسلمانوں میں نہیں بلکہ دوسرے مذاہب میں بھی چاہے نام کوئی دوسرا ہو مگر ایک آنے والے کا آخر زمانہ میں انتظار ہے۔ ولادت کے قبل سے پیدائش کا انتظار رہا اور اب غیبت کے بعد دنیا کو ظہور کا انتظار ہے اس لیے آپ خود حضرت حکم الٰہی کے مُنتَظِر ہوتے ہوئے تمام خلق کے لیے مُنتَظَر یعنی مرکزِ انتظار ہیں۔

پیشین گوئیاں

آپ کے دنیا میں آنے سے پہلے پیشین گوئی متواتر طریقہ سے پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ معصومینؑ کی زبانوں پر آتی رہی تھی جن میں سے ہر معصوم کی صرف ایک خبر اس موقع پر درج کی جاتی ہے۔

حضرت خاتم النبیّین محمد مصطفےٰؐ (۱)

حضرتؐ کی زبان مبارک سے احادیث اس کثرت سے اس موضوع پر وارد ہوتے ہیں کہ صحاح و مسانید ان سے معمور ہیں اور متعدد علمائے اہلسنت نے ان کو مستقل تصانیف میں جمع کیا ہے جیسے حافظ محمد بن یوسف گنجی شافعی نے البیان فی اخبار صاحب الزمان

میں حافظ ابونعیم اصفہانی نے ذکر "لغت المہدی" اس کے علاوہ ابوداؤد سجستانی نے اپنے سنن میں جس کا صحاح ستہ میں شمار ہوتا ہے کتاب "المہدی" کا مستقل عنوان قائم کیا ہے اسی طرح ترمذی نے صحیح میں اور ابن ماجہ قزوینی نے اپنی کتاب "سنن" میں اور حاکم نے "مستدرک" میں بھی ان احادیث کو وارد کیا ہے۔

صرف ایک حدیث یہاں درج کی جاتی ہے جسے محمد بن ابراہیم حموی شافعی نے اپنی کتاب فرائد السمطین میں درج کیا ہے۔ ابنِ عباسؓ نے روایت کی حضرت رسول خداؐ نے فرمایا اَنَا سَیِّدُ النَّبِیِّیْنَ وَعَلِیٌّ سَیِّدُ الْوَصِیِّیْنَ وَاَمَّا اَوْصِیَائِیْ بَعْدِیْ اِثْنَا عَشَرَ اَوَّلُھُمْ عَلِیٌّ وَّاٰخِرُھُمُ الْمَھْدِیُّ "میں انبیا کا سردار ہوں اور علیؑ اوصیاء کے سردار ہیں۔ میرے اوصیاء (قائم مقام)، میرے بعد بارہ ہوں گے جن میں اوّل علیؑ ہیں اور آخری "مہدیؑ" ہوں گے"

حضرت سیدۃ النساءؑ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا

کافی کلینی میں جابر بن عبداللہؓ انصاری کی روایت ہے کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کے پاس ایک لوح تھی جس میں تمام اوصیاء و آئمہ کے نام درج تھے۔ جناب سیدۃؑ نے اس لوح سے بارہ اماموں کے ناموں کی خبر دی جن میں سے تین محمدؐ تھے اور چار علیؑ۔ ان کا آخری فرد آپ کی اولاد میں سے وہ ذات ہے جو قائمؑ ہوگا۔

حضرت امیرالمومنین علیؑ بن ابی طالبؑ

جناب شیخ صدوق محمدؒ بن علی بن بابویہ قمی نے "اکمال الدین" میں امام رضاؑ کی حدیث آپ کے آبائے طاہرین کے ذریعہ سے نقل کی ہے کہ جناب امیرؑ نے اپنے فرزند امام حسینؑ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ تیری نسل میں سے نواں وہ ہے جو حق کے ساتھ قائمؑ، دین کا ظاہر کرنے والا اور عدل و انصاف کا پھیلانے والا ہوگا۔

امام حسن مجتبیٰ

(صدوق اکمال الدین) میرے بھائی حسینؑ کی نسل سے نواں جب پیدا ہوگا تو خداوندِ عالم اس کی عمر کو غیبت کی حالت میں طولانی کرے گا پھر جب وقت آئے گا تو اسے اپنی قدرت کاملہ سے ظاہر فرمائے گا۔

سید الشہداء امام حسینؑ

نواں میری نسل سے وہ امام ہے جو حق کے ساتھ قائم ہوگا۔ جس کے ذریعے سے اللہ زمین کو موت کے بعد زندگی عطا کرے گا اور جس کے ذریعے سے دینِ حق کو تمام مذاہب پر غلبہ حاصل ہوگا اس کی ایک طولانی غیبت ہوگی جس میں بہت سے گمراہ ہو جائیں گے اور کچھ ثابت قدم رہیں گے جنھیں ایذائیں برداشت کرنا پڑیں گی اور ان سے لوگ کہیں گے کہ اگر سچے ہو تو بتاؤ یہ وعدہ پورا کب ہوگا۔ جب اس غیبت کے زمانہ میں اس اذیت اور انکار پر صبر کریں گے۔ انھیں رسولؐ کے ہمراہ رکاب جہاد کرنے کا ثواب حاصل ہوگا۔

امام زین العابدینؑ

ہم میں سے قائمؑ وہ ہوگا جس کی ولادت لوگوں سے پوشیدہ رہے گی۔ یہاں تک کہ عام لوگ کہیں گے وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔

امام محمد باقرؑ

(کافی کلینی) "حسینؑ کے بعد نو امام معیّن ہیں جن میں سے نواں امام قائمؑ ہوگا"۔

امام جعفر صادقؑ

علل الشرائع شیخ صدوقؒ میں روایت ہے فرمایا حضرتؑ نے کہ میرے موسیٰؑ فرزند کی

نسل سے پانچواں قائم آلِ محمدؐ ہوگا۔

امام موسیٰ کاظمؑ

(کمال الدین صدوق) کسی نے امام موسیٰ کاظمؑ سے کہا کہ کیا آپ قائم بحق ہیں حضرتؑ نے فرمایا حق کے ساتھ قائم و برقرار تو میں بھی ہوں مگر اصل میں قائم وہ ہوگا جو زمین کو دشمنانِ خدا سے پاک کردے گا اور اسے عدل و انصاف سے مملو کردے گا وہ میری اولاد میں سے پانچواں شخص ہوگا۔ اس کی ایک طولانی غیبت ہوگی جس میں بہت سے مرتد ہو جائیں گے اور کچھ لوگ ثابت قدم رہیں گے۔

امام رضا علیہ السلام

دعبلؓ نے آپ کے سامنے جب اپنا مشہور قصیدہ پڑھا اور اس میں ان دو شعروں تک پہنچے۔

خُرُوجُ الْاِمَامِ لَا مُحَالَۃَ قَائِمٌ — يقوم على اسم الله والبركات
يُبَيِّنُ لَنَا كُلَّ حَقٍّ وَّبَاطِلٍ — وَيَجْزِي عَلَى النَّعْمَاءِ وَالنَّقِمَاتِ
زمانہ میں ظہورِ قائمِ آلِ عباؑ ہوگا — مدد سے جو خدا کے نام و برکت کی کھڑا ہوگا
جہاں میں امتیازِ حق و باطل آکے کردیگا — وہ دیگا مومن و کافر کو ہر کردار کا بدلا

یہ سنتے ہی امام رضاؑ نے گریہ فرمایا اور پھر سر اٹھا کر کہا اے دعبلؓ یہ شعر تمہاری زبان پر روح القدس نے جاری کرائے ہیں۔ تمہیں معلوم بھی ہے کہ یہ امامؑ کون ہے اور کب کھڑا ہوگا؟ دعبلؓ نے کہا یہ تفصیلات تو مجھے معلوم نہیں مگر میں یہ سنتا رہا ہوں کہ آپ میں ایک امام ایسا ہوگا جو زمین کو فساد سے پاک اور عدل و انصاف سے مملو کردیگا حضرتؑ نے فرمایا اے دعبلؓ میرے بعد امام میرا فرزند محمدؑ ہوگا۔ اور اس کے بعد اس کا فرزند علیؑ اور علیؑ کے بعد اس کا بیٹا حسنؑ اور حسنؑ کے بعد اس کا بیٹا قائمؑ ہوگا جس کی غیبت کے دور میں اس کا انتظار رہے گا اور ظہور کے موقع پر دنیا اس کے سامنے سر تسلیم خم کرے گی۔

maablib.org

امام محمد تقیؑ

قائم ہم میں سے وہی مہدیؑ ہوگا جو میری نسل میں تیسرا ہوگا۔

امام علی نقیؑ

میرا جانشین تو بعد میرے میرا فرزند حسنؑ ہے مگر اس کے جانشین کے دور میں تمھارا کیا عالم ہوگا؟ سننے والوں نے پوچھا کہ کیوں؟ اس کا کیا مطلب؟ فرمایا اس لیے کہ تمھیں اسے دیکھنے کا موقع نہ ملے گا۔ بعد اس کے نام لینے کی اجازت نہ ہوگی۔ عرض کیا گیا پھر ان کا نام کس طرح لیا جائے گا؟ فرمایا بس یوں کہنا کہ "الحجۃ من آلِ محمدؐ"۔

امام حسن عسکریؑ

حضرتؑ سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ کے آبائے طاہرینؑ نے فرمایا ہے کہ زمین حجتِ خدا سے قیامت تک کبھی خالی نہیں ہوسکتی؟ اور جو مر جائے اور اپنے امامِ زمانہ کی معرفت اسے حاصل نہ ہوئی ہو وہ جاہلیت کی موت دنیا سے گیا۔ آپ نے فرمایا کہ بیشک یہ اسی طرح حق ہے جس طرح روزِ روشن حق ہوتا ہے۔ عرض کیا گیا کہ پھر حضور کے بعد حجت اور امام کون ہوگا؟ فرمایا میرا فرزند جو پیغمبرِ خداؐ کا ہمنام ہے میرے بعد امام و حجت ہوگا۔ جو شخص بغیر اس کی معرفت حاصل کئے ہوئے دنیا سے اٹھا وہ جاہلیت کی موت مرا۔ بیشک اس کی غیبت کا دور اتنا طولانی ہوگا جس میں جاہل لوگ حیران اور سرگرداں پھریں گے اور باطل پرست ہلاکتِ ابدی میں گرفتار ہونگے۔ وقت مقرر کر کے پیشین گوئیاں کرنے والے غلط گو ہونگے۔

ان تمام احادیث سے معلوم ہوا کہ پیغمبر اسلام کے وقت سے لے کر برابر ہر دور میں اس ذات کی خبر دی جاتی رہی تھی۔ جو مہدیِ دین ہوگا۔ بلکہ دعبلؒ کی روایت سے ظاہر ہے کہ یہ امر اتنا مشہور تھا کہ شعراء تک اسے نظم کرتے تھے۔ اس کے ساتھ تواریخ

پر نظر کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوست و دشمن سب ان حدیثوں سے واقف تھے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات ان سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ سلسلہ عباسیہ میں سے محمدؐ نام جس کا تھا اس نے اپنا لقب مہدی اسی لیے اختیار کیا اور نسل امام حسینؑ سے عبداللہ محض کے فرزند محمدؐ کے متعلق بھی مہدی ہونے کا عقیدہ قائم کیا گیا اور کیسانیہ نے محمد حنفیہ کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا مگر آئمہ اہلبیتؑ میں سے ایک معصوم ہستی کا اسی وقت پر وجود خود ان خیالات کی رد کے لیے کافی تھا اور یہ حضرات ان غلط دعویداروں کے دعاوی کے غلط بتانے کے ساتھ ساتھ اصل مہدی کے اوصاف اور اس کی غیبت کا تذکرہ برابر کرتے رہے اس سے یہ حقیقت صاف ظاہر ہو گی کہ اصل مہدی کی تشریف آوری کا انتظار متفقہ طور پر موجود تھا۔ اس کے ساتھ پیغمبرؐ کی وہ حدیثیں بھی متواتر صورت سے موجود تھیں کہ میری اولاد میں بارہ جانشین میرے ہوں گے اور تعداد خود ان غلط مدعیوں کے دعوے کے بطلان کے لیے کافی تھی۔ لیکن اب جبکہ امام حسن عسکریؑ تک گیارہ کی تعداد آئمہ کی پوری ہو گئی تو دنیا بے چینی کے ساتھ اسی امام کی طلبگار ہو گئی جو اپنی پیدائش کے قبل بھی منتظر تھا اور پیدائش کے بعد بھی غیبت کی بنا پر مصلحت الٰہی کے تقاضا تک منتظر رہنے والا تھا۔

ولادت

وہ وقت جس کا معصومینؑ کو انتظار تھا آخر کو آ ہی گیا اور پندرہ شعبان ۲۵۵ھ کی رات کو سامرے میں اس مبارک و مقدس بچے کی ولادت ہوئی۔ امام حسن عسکریؑ نے اس موقع پر کافی مقدار میں روٹیاں اور گوشت راہِ خدا میں صدقہ کرایا اور عقیقہ میں کئی بکروں کی قربانی فرمائی۔

نشوونما و تربیت

آئمہ اہل بیتؑ میں یہ کوئی نئی بات نہیں کہ ان کو ظاہری حیثیت سے تعلیم و تربیت

کاموقع حاصل نہ ہو سکا ہو اور وہ بچپن ہی میں قدرت کی طرف کے انتظامِ خاص کے ساتھ کمالات کے جوہر سے آراستہ کر کے امامت کے درجہ پر فائز کر دیتے گئے ہوں اس کی نظیریں حضرت "امامِ منتظرؑ" کے پہلے بھی کئی سامنے آچکی تھیں جیسے آپ کے جدِ بزرگوار حضرت امام علی نقیؑ جن کی عمر اپنے والد محمد تقیؑ کی وفات کے وقت چھ برس اور چند مہینہ سے زیادہ نہ تھی اور اس کے پہلے امام محمد تقیؑ جن کی عمر اپنے والد امام رضاؑ کے انتقال کے وقت آٹھ برس سے زیادہ نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ مدت عام افراد کے لحاظ سے بظاہر اسبابِ نشوونما اور تعلیم و تربیت کے لیے ناکافی ہے مگر جب خالق کی مخصوص عطا کو ان حضرات کے بارے میں تسلیم کر لیا تو اب سات اور چھ اور پانچ برس کے فرق کا بھی کوئی سوال باقی نہیں رہ سکتا۔ اگر سات برس کے سن میں امامت کا منصب حاصل ہو سکتا ہے اور چھ برس کے سن میں حاصل ہو سکتا ہے جس کی نظیریں قبل کے اماموں کے یہاں دنیا کی آنکھوں کے سامنے آچکیں تو پانچ یا چار برس میں بھی یہ منصب اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

بارھویں امام کو اپنے والد کی آغوشِ شفقت و تربیت سے بہت کم عمر میں جدا ہونا پڑا یعنی شعبان ۲۵۵ھ میں آپ کی ولادت ہوئی اور ربیع الاوّل ۲۶۰ھ میں آپ کے والد بزرگوار حضرت امام حسن عسکریؑ کی وفات ہو گئی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی عمر اس وقت صرف ساڑھے چار برس کی تھی اور اسی کمسنی میں آپ کے سر پر خالق کی طرف سے امامت کا تاج رکھ دیا گیا۔

حکومتِ وقت کا تجسّس

بالکل اسی طرح جیسے فرعونِ مصر نے یہ پیشین گوئی سن لی تھی کہ بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والا ایک بچہ میرے ملک کی تباہی کا باعث ہوگا تو اس نے اس کی کوششیں صرف کر دیں کہ وہ بچہ کسی طرح پیدا ہی نہ ہونے پائے اور پیدا ہو تو زندہ نہ رہنے پائے اسی طرح متواتر احادیث کی بنا پر عباسی سلطنت کے فرمانرواؤں کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ حسن عسکریؑ کے

یہاں اس مولود کی پیدائش ہو گی جس کے ذریعے باطل حکومتیں تباہ ہو جائیں گی تو اس کی طرف سے انتہائی شدت کے ساتھ انتظامات کیے گیے کہ ایک ایسے مولود کی پیدائش کا امکان باقی نہ رہے اسی لیے امام حسن عسکریؑ کو مسلسل قید و بند میں رکھا گیا مگر قدرتِ الٰہی کے سامنے کوئی بڑی سے بڑی مادی طاقت بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

جس طرح فرعون کی تمام کوششوں کے باوجود موسیٰؑ پیدا ہوئے اسی طرح سلطنت عباسیہ کے تمام انتظامات کے باوجود "امامِ منتظرؑ" کی ولادت ہوئی مگر یہ قدرت کی طرف کا انتظام تھا کہ آپ کی پیدائش کو صیغۂ راز میں رکھا گیا اور جسے قدرت اپنا راز بنائے اس کے افشا پر کون قادر ہو سکتا ہے؟ بیشک ذرا دیر کے لیے خود اس کی مصلحت اس کی متقاضی ہوئی کہ راز پر سے پردہ ہٹایا جائے۔ جب امام حسن عسکریؑ کا جنازہ غسل و کفن کے بعد نمازِ جنازہ کے لیے رکھا ہوا تھا۔ شیعیانِ خاص کا مجمع تھا اور نماز کے لیے صفیں بندھ چکی تھیں، امام حسن عسکریؑ کے بھائی جعفر نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے آگے بڑھ چکے تھے اور تکبیر کہنا ہی چاہتے تھے کہ ایک دفعہ حرم سرائے امامت سے ایک کمسن بچہ برآمد ہوا اور بڑھتا ہوا صفوں کے آگے پہنچا اور جعفر کی عبا کو ہاتھ میں لے کر کہا "چچا! پیچھے ہٹیے، اپنے باپ کی نمازہ جنازہ پڑھانے کا حق مجھے زیادہ ہے۔" جعفر بے ساختہ پیچھے ہٹے اور صاحبزادہ نے آگے بڑھ کر نماز پڑھائی۔ پھر صاحبزادہ حرم سرا میں واپس گیا۔ غیر ممکن تھا کہ یہ خبر خلیفہ وقت کو نہ پہنچتی چنانچہ پہنچی اور اب زیادہ شدت و قوت کے ساتھ تلاش شروع ہو گئی کہ ان صاحبزادہ کو گرفتار کر کے قید کر دیا جائے اور ان کی زندگی کا خاتمہ کیا جائے۔

غیبت

حضرت امامِ منتظرؑ کی امامت کا زمانہ اب تک دو غیبتوں میں تقسیم رہا ہے۔ ایک زمانہ "غیبتِ صغریٰ" اور ایک "غیبت کبریٰ"، اس کی بھی خبر معصومینؑ کی زبان پر پہلے آچکی تھی جیسے پیغمبر خدا کا ارشاد "اس کے لیے ایک غیبت ہو گی جس میں بہت سی جماعتیں

maablib.org

گمراہ پھرتی رہیں گی" اور اس کی غیبت کے زمانہ میں اس کے اعتقاد پر برقرار رہنے والے "گوگرد سرخ" سے زیادہ نایاب ہوں گے۔ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کا ارشاد ہے۔ قائم آلِ محمدؐ کے لیے ایک طولانی غیبت ہو گی۔ میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے وہ منظر کہ دوستانِ اہلبیتؑ اس کی غیبت کے زمانے میں سرگرداں پھر رہے ہیں جس طرح جانور چراگاہ کی تلاش میں سرگرداں پھرتے ہیں۔

دوسری حدیث میں اس کا ظہور ایک ایسی غیبت اور حیرانی کے بعد ہوگا جس میں اپنے دین پر صرف بااخلاص اصحابِ یقین ہی قائم رہ سکیں گے۔ امام حسنؑ کا قول "اللہ اس کی عمر کو اس کی غیبت کی حالت میں طولانی کرے گا" امام حسینؑ کا ارشاد "اس کی ایک غیبت ہو گی جس سے بہت سی جماعتیں گمراہ ہو جائیں گے" امام محمد باقرؑ کا ارشاد "اس کی غیبت اتنی طولانی ہو گی کہ بہت سے گمراہ ہو جائیں گے" امام جعفر صادقؑ نے فرمایا "مہدی ساتویں امام کی اولاد میں سے پانچواں ہوگا۔ اس کی ہستی تمھاری نظروں سے غائب رہے گی" دوسری حدیث میں صاحب الامر کے لیے ایک غیبت ہونے والی ہے۔ اس وقت ہر شخص کو لازم ہے کہ تقویٰ اختیار کرے اور اپنے دین پر مضبوطی سے قائم رہے" امام موسیٰ کاظمؑ فرماتے ہیں۔ "اس کی صورت لوگوں کی نگاہوں سے غائب ہو گی مگر اس کی یاد اہلِ ایمان کے دلوں سے غائب نہ ہو گی۔ وہ ہمارے سلسلے کا بارہواں ہوگا" امام رضاؑ "اس کی غیبت کے زمانہ میں اس کا انتظار رہے گا" امام محمد تقیؑ "مہدی وہ ہے جس کی غیبت کے زمانہ میں اس کا انتظار اور ظہور کے وقت پر اس کی اطاعت لازم ہو گی" امام علی نقیؑ "صاحب الامر وہ ہوگا جس کے متعلق بہت سے لوگ کہتے ہوں گے وہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوا" امام حسن عسکریؑ "میرے فرزند کی غیبت ایسی ہوگی کہ سوائے ان لوگوں کے جنھیں اللہ محفوظ رکھے سب شک و شبہ میں مبتلا ہو جائیں گے" اسی کے ساتھ امام محمد باقرؑ نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ "قائم آلِ محمدؐ کے لیے دو غیبتیں ہیں۔ ایک بہت طولانی اور ایک اس کی بہ نسبت مختصر" امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ "ایک دوسرے کی بہ نسبت طولانی ہو گی" ان ہی احادیث کے پہلے سے موجود ہونے کا نتیجہ تھا کہ امام حسن عسکریؑ کے بعد ان کے اصحاب اور مومنین مخلصین کس

شک و شبہ میں مبتلا نہیں ہوتے اور انھوں نے کسی حاضر الوقت مدعی امامت کو تسلیم کرنے کے بجائے اس "امام غائبؑ" کے تصور کے سامنے سر تصدیق خم کر دیئے۔

غیبتِ صغریٰ

پہلی غیبت کا دور ۲۶۰ھ سے ۳۱۹ھ تک انہتر سال قائم رہا۔ اس میں سفراء خاص موجود تھے یعنی ایسے حضرات جن کو مخصوص طور پر نام کی تعیین کے ساتھ امامؑ کی جانب سے نائب بتایا گیا تھا کہ شیعوں کے مسائل امامؑ تک پہنچائیں۔ ان کے جوابات حاصل کریں اموال زکوٰۃ و خمس کو جمع کر کے انھیں مصارف خاصہ میں صرف کریں اور جو قابلِ اعتماد اشخاص ہوں ان تک خود امامؑ کی تحریکات کو بھی پہنچا دیں ورنہ خود حضرتؑ سے دریافت کر کے ان کے مسائل کا جواب دے دیں۔ یہ حضرات علم و تقویٰ اور رازداری میں اپنے زمانے کے سب سے زیادہ ممتاز اشخاص تھے اس لیے ان کو امامؑ کی جانب سے اس خدمت کا اہل سمجھا جاتا تھا۔ یہ حسب ذیل چار بزرگوار تھے۔

۱۔ ابو عمرو عثمان بن سعید بن عمرو عمری اسدیؓ یہ پہلے امام علی نقیؑ کے بھی سفیر رہے تھے پھر امام حسن عسکریؑ کے زمانے میں بھی اس خدمت پر مامور رہے اور پھر حضرت "امامؑ منتظر" کی جانب سے بھی سب سے پہلے اسی عہدہ پر یہی قائم رہے۔ چند سال اس خدمت کو انجام دے کر بغداد میں انتقال کیا وہیں دفن ہوتے۔

۲۔ ان کے فرزند ابو جعفر محمد بن عثمان بن سعیدؓ عمری امام حسن عسکریؑ نے ان کے منصب سفارت پر برقرار ہونے کی خبر دی۔ پھر ان کے والد نے اپنے وفات کے وقت بحکم امامؑ ان کی نیابت کا اعلان کیا۔ جمادی الاوّل ۳۰۵ھ میں بغداد میں وفات پائی۔

۳۔ ابوالقاسم حسین بن روح بن ابی بحرؓ نوبختی۔ علم و حکمت، کلام و نجوم میں خاص امتیاز رکھنے ہوئے مشہور خاندان نوبختی کی یادگار اور خود بڑے جلیل المرتبت پرہیزگار عالم تھے۔ ابو جعفر محمد بن عثمانؓ نے اپنی وفات کے بعد امامؑ کے حکم سے ان کو اپنا قائم مقام بنایا۔ پندرہ برس عہدہ سفارت انجام دینے کے بعد شعبان ۳۲۰ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

۴۔ ابوالحسن علی بن محمد سمریؓ۔ یہ آخری نائب تھے۔ حسین بن روحؒ کے بعد بحکم امامؑ ان کے قائم مقام ہوئے اور صرف نو برس اس فریضہ کو انجام دینے کے بعد ۱۵ شعبان ۳۲۹ھ میں بغداد میں انتقال کیا۔ وقت آخر جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے بعد نائب کون ہوگا تو انھوں نے کہہ دیا کہ اب اللہ کی مشیت ایک دوسری صورت کا ارادہ رکھتی ہے جس کی آخری مدت اسی کو معلوم ہے۔

اب اس کے بعد کوئی نائب خاص باقی نہ رہا۔ اسی ۳۲۹ھ کے اندوہناک سال میں کافی کے مصنف ثقۃ الاسلام محمد بن یعقوب کلینیؒ اور شیخ صدوقؒ کے والد بزرگوار علی بن بابویہ قمیؒ نے بھی انتقال فرمایا تھا اور ان حوادث کے ساتھ غیر معمولی طور پر یہ منظر دیکھنے میں آیا کہ آسمان پر ستارے اس کثرت سے ٹوٹ رہے ہیں کہ ایک محشر معلوم ہوتا ہے اس لیے اس سال کا نام رکھ دیا گیا "عام تناثر النجوم" یعنی ستاروں کے انتشار کا بد سال۔ اس کے بعد اندھیرا چھا گیا۔ سخت اندھیرا یہ اس لیے کہ کوئی ایسا شخص سامنے نہ رہا جو امامؑ کی خدمت میں پہنچنے کا وسیلہ ہو۔

غیبتِ کبریٰ

۳۲۹ھ کے بعد سے جو زمانہ ہے اسے "غیبتِ کبریٰ" کہتے ہیں۔ اس لیے کہ اب کوئی خاص نائب بھی باقی نہیں رہا ہے۔ اس دور کے لیے خود حضرت "امام عصرؑ" نے یہ ہدایت فرما دی تھی کہ "اس صورت میں دیکھنا جو لوگ ہمارے احادیث پر مطلع ہوں اور ہمارے حلال و حرام یعنی مسائل سے واقف ہوں ان کی طرف رجوع کرنا۔ یہ ہماری جانب سے تمہارے اوپر حجت ہیں" اس حدیث کی بنا پر علمائے شیعہ اور مجتہدین کو "نائب امام" کہا جاتا ہے مگر یہ نیابت باعتبار صفات عمومی حیثیت سے ہے۔ خصوصی طور پر باعتبار نامزدگی نہیں ہے۔ یہی خاص فرق ہے ان میں اور ان نائبین میں جو "غیبتِ صغریٰ" کے زمانہ میں اس منصب پر فائز تھے۔ اس زمانہ میں بھی یقیناً امامؑ ہدایتِ خلق اور حفاظتِ حق کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور ہماری کسی نہ کسی صورت سے رہنمائی فرماتے ہیں خواہ وہ

ہمارے سامنے نہ ہوں اور ہمیں محسوس و معلوم نہ ہو۔ یہ پردہ اس وقت تک رہے گا جب تک مصلحتِ الٰہی متقاضی ہو۔ اور ایک وقت ایسا جلد آئے گا (خواہ وہ جلد ہمیں کتنی ہی دور معلوم ہوتا ہو) کہ یہ پردہ ہٹے گا اور امام علیہ السلام ظاہر ہوں گے اور دنیا کو عدل و انصاف سے معمور فرمائیں گے۔ اسی طرح جیسے وہ اس کے پہلے ظلم و جور سے مملو ہو چکی ہو گی۔ اللھم عجل اللہ فرجہ و سھل مخرجہ

قرآن فہمی کے لیے
عہدِ حاضر کی شہرہ آفاق
تفسیر
فصل الخطاب
سات جلدوں میں مکمل سیٹ
از
علامہ سید علی نقی النقوی
کا مطالعہ کیجیے
ناشر: مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور
ملنے کا پتہ: قرآن سنٹر ۲۴۔ الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور
maablib.org

قرآن فہمی کے لیے :

دورِ حاضر کی عظیم تفسیر قرآن

تفسیر نمونہ

کا مطالعہ ناگزیر ہے

اپنے قریبی بک سٹال سے رجوع فرمائیں

مصباح القرآن ٹرسٹ

۱۰۔ گنگارام بلڈنگ، شاہراہ قائدِ اعظم۔ لاہور

ملنے کا پتہ } قرآن سنٹر ۲۴، الفضل مارکیٹ
اردو بازار، لاہور

اسلام شناسی کے لیے

مصباح الہدیٰ

پبلیکیشنز کی

شائع کردہ کتب کا مطالعہ کریں

ملنے کا پتہ

قرآن سنٹر ۲۴-۱ الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور

مطبوعاتِ مصباح القرآن

قرآن پاک (معریٰ) رنگین		ہدیہ	۲۵۰	روپے
قرآن پاک (معریٰ) سفید کاغذ		ہدیہ	۵۰	روپے
قرآن پاک مترجم	از مولانا فرمان علی	ہدیہ	۲۰۰	روپے
تفسیر نمونہ (۲۷ جلدیں)	ترجمہ مولانا سید صفدر حسین نجفی	ہدیہ	۱۲۵	روپے (فی جلد)
قرآن کا دائمی منشور		ہدیہ	۱۲۵	روپے
تفسیر پیام قرآن		ہدیہ	۱۲۵	روپے
ہمارے آئمہؑ (۱۲ کتابوں کا سیٹ)		ہدیہ	۲۴۰	روپے (فی سیٹ)
ولایت فقیہ (جلد اول)		ہدیہ	۱۳۰	روپے
ولایت فقیہ (جلد دوم)		ہدیہ	۱۵۰	روپے
تفسیر فصل الخطاب (۷ جلدیں)	علامہ سید علی نقی النقوی	ہدیہ	۱۲۵	روپے (فی جلد)
تحریف قرآن کی حقیقت		ہدیہ	۲۵	روپے
صلح اور جنگ		ہدیہ	۱۰	روپے
مذہب اور عقل		ہدیہ	۲۰	روپے
رہنمایانِ اسلام		ہدیہ	۳۰	روپے
اُسوۂ حسینی		ہدیہ	۲۵	روپے
اثباتِ پردہ		ہدیہ	۲۰	روپے
معراجِ انسانیت		ہدیہ	۱۵	روپے
زندگی کا حکیمانہ تصور		ہدیہ	۲۵	روپے
آیت الکرسی	ترجمہ مولانا محمد تقی نقوی	ہدیہ	۷۰	روپے
مدخل التفسیر	، ،	ہدیہ	۵۰	روپے
آیۂ تطہیر	، ،	ہدیہ	۳۰	روپے
توضیح المسائل	آقائے گلپائیگانی رحمۃ اللہ علیہ	ہدیہ	۶۵	روپے
مختصر الاحکام		ہدیہ	۳۰	روپے
گفتارِ انبیاء	آقائے لنگرودی	ہدیہ	۴۰	روپے

maablib.org

انوار القرآن	ترجمہ و حواشی مولانا ذیشان حیدر جوادی	ہدیہ	۳۰۰	روپے
میزان الحکمت (جلد اوّل)	ترجمہ مولانا محمد علی فاضل	ہدیہ	۲۵۰	روپے
تاریخِ قرآن	ڈاکٹر محمود رامیار	ہدیہ	۱۵۰	روپے
قرآن اہلبیت کی نظر میں	جعفر الہادی ترجمہ شفا نجفی	ہدیہ	۲۰	روپے
قرآن فہمی	استاد مطہری شہید ترجمہ سید انوار احمد بلگرامی	ہدیہ	۱۵	روپے
معاد قرآن کی نظر میں	آیت اللہ مظاہری ترجمہ 〃 〃 〃	ہدیہ	۲۵	روپے
مدینۃ العلم (ارشادات پیغمبر اکرمؐ)	ترجمہ سید جاوید جعفری	ہدیہ	۲۰	روپے
خطبہ مؤنقہ (ارشادات علیؑ ابن ابی طالب)	〃 〃 〃	ہدیہ	۱۰	روپے
اسلام میں مقام قرآن و عترت	ترجمہ سید محمد حسین زیدی	ہدیہ	۳۰	روپے
صحیفۂ پنجتن پاک	آغا حسن رضا غدیری	ہدیہ	۲۰	روپے
تحفۃ الابرار	〃 〃	ہدیہ	۱۵	روپے
ردِ دہریت	کیپٹن فہیم رضا	ہدیہ	۲۵	روپے
اسلامی اقتصادیات	حافظ سید ریاض حسین نجفی	ہدیہ	۱۵	روپے
آئین تربیت	ترجمہ ثاقب نقوی، قیصر عباس	ہدیہ	۴۰	روپے
خلاصہ الغدیر	مولانا رضی جعفر نقوی	ہدیہ	۴۵	روپے
مسئلہ خمس	مولانا ابن حسن نجفی	ہدیہ	۲۵	روپے
تعلیماتِ اسلام	مولانا شیخو علی تابر نجفی	ہدیہ	۱۵	روپے
خاندان اور انسان	مولانا ذیشان حیدر جوادی	ہدیہ	۲۵	روپے
توحید القرآن	مولانا محمد ہارون زنگی پوری	ہدیہ	۵۰	روپے
شیعہ اور تحریفِ قرآن	آقائے علی میلانی	ہدیہ	۲۵	روپے
مبانی حکومت اسلامی	آیت اللہ جعفر سبحانی	ہدیہ	۴۰	روپے
میراثِ انبیاء	سید مجتبیٰ حسین	ہدیہ	۴۰	روپے
معاد	آقائے محمد تقی فلسفی	ہدیہ	۱۰۰	روپے

قرآن سنٹر ۲۴، الفضل مارکیٹ۔ اردو بازار لاہور

فون: ۷۳۱۴۳۱۱

maablib.org

MAAB 1431
maablib.org

مرکز احیاء آثار برّ صغیر
MAAB 1431
maablib.org